ادبستان

(مجموعۂ نظم و نثر)

مرتبہ

پروفیسر اختر قادری

و

پروفیسر محمد سلیمان

ال۔ اِس کالج، مظفرپور

(بہار یونیورسٹی)

شائع کردہ

کتاب گھر۔ اسلام پور مظفرپور

پیش لفظ

ہار اسٹیٹ یونیورسٹی کمیشن کے زیر اہتمام بہار کی تمام یونیورسیٹیوں کے
ار اور نمائندہ اساتذۂ اُردو نے بہار یونیورسیٹی اور ڈگری اوّل کلاسوں
ید ہندوستانی زبانوں کے سلسلے میں اُردو زبان کے نصابِ تعلیم کا موڈل
س کے طور پر ایک خاکہ تیار کیا ہے۔

اس مجموعۂ نظم و نثر کی ترتیب اسی خاکے کے مطابق کی گئی ہے۔ اس مجموعے
س غزل گویوں، دس نظم نگاروں اور سترہ نثّاروں کے ادب پارے داخل
یہ ادب پارے قدیم اور جدید ادیبوں کے منتخب اور نمائندہ تخلیقات
یہ ضرور ہے کہ ان تخلیقات کا انتخاب ان درجوں کے طلباء کی ضرورت
یا لحاظ رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔

عام طور سے زباندانی کے نصاب میں انتخابات داخل کیے جاتے ہیں۔
یہ انتخابات کسی اصول کو مدِ نظر رکھنے کی بجائے انتخاب کرنے والوں کی
ت کے لحاظ سے مرتب کیے جاتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ موڈل سلیبس
صولوں کی بنیاد پر ترتیب دیئے ہوئے اس مجموعے سے طالب العلموں کو
غزل، نظم اور نثر کے تدریجی ارتقاء کا اندازہ ہو سکے گا اور موڈل سلیبس
تِ اوّل طلباء اور اساتذہ میں اپنی افادیت کے لحاظ سے مقبول ہوگا۔

مُرتّب

فہرس

منظومات

غزلیات

ولی

محمد ولی اللہ نام ولی تخلص سنہ ۱۶۶۸ء میں احمد آباد گجرات میں پیدا ہوئے۔ اُردو کے سب سے پہلے بلندمرتبہ شاعر ہیں۔ آپ کی شاعری کے اثر سے شمالی ہند میں اردو شاعری نے رواج پایا۔ آپ کے کلام میں دکنی الفاظ اور ترکیبیں کثرت سے ہیں۔ لیکن ایسا کلام بھی ملتا ہے جو آج کل کی زبان میں ہے۔ عشق و محبت، تصوف اور اخلاق کے مضامین اشعار میں ملتے ہیں۔

آپ کا انتقال سنہ ۱۷۰۷ میں احمد آباد میں ہوا۔

۱

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو! ہشیار رہو ہشیار رہو
کب تک رہے گا خواب میں' بیدار رہو بیدار رہو
گر دیکھنا ہے مُدّعا اس شاہدِ معنیٰ کا تو
ظاہر پرستاں سوں سدا بیزار رہو بیزار رہو
جیوں چتر داغِ عشق کوں رکھ سر پہ اپنے اوّلاً
تب فوجِ اہلِ درد کا سردار ہو سردار رہو
وہ نورِ چشمِ عاشقاں ہے جیوں سحر جگ میں عیاں
اے دیدۂ وقتِ خواب میں بیدار رہو بیدار رہو
مطلع کا مصرعہ اے ولی وردِ زباں کر رات دن
غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار رہو ہشیار رہو

۲

قبلۂ اہلِ صفا شمشیر ہے
ہادیٔ مشکل کشا شمشیر ہے
غازیاں اہلِ سعادت کیوں نہ ہوں
سایۂ بالِ ہما شمشیر ہے

زندۂ جاوید شہیداں کیوں نہ ہوں
موجۂ آبِ بقا شمشیر ہے

سالکِ راہ فنا کوں دم بدم
آخرت کی رہنما شمشیر ہے

راہِ غربت میں کہ مشکل ہے تمام
ناتوانوں کا عصا شمشیر ہے

دشمناں کیوں کر سکیں مکر و فریب
صیقلِ زنگِ دغا شمشیر ہے

ہے کلیدِ فتحِ بابِ مدعا
ناخنِ مشکل کشا شمشیر ہے

کیوں نہ ہووے قتلِ عاشق دم بدم
شوخ کی بانکی ادا شمشیر ہے

جن نے پکڑا گوشۂ آزادگی
اس کوں موجِ بوریا شمشیر ہے

سراج

سراج الدین نام۔ سراج تخلص۔ ۱۷۱۴ء میں اورنگ آباد دکن
میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔
ولی کے بعد سراج نے اردو شاعری کو کافی ترقی دی۔ زبان
لطیف اور پاکیزہ ہے۔ بیان میں حسن اور دلکشی ہے۔
اردو اور فارسی کا دیوان اور ایک مثنوی آپ کی
یادگار ہے۔ ۱۷۶۴ء میں وفات پائی۔

(۳)

خبرِ تحیرِ عشق سُن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا، نہ تو مَیں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بے خودی نے عطا کیا، مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دِل کہیں سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سے بیاں کروں
کہ شرابِ حسرت و آرزو خُمِ دل میں تھی سو بھری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کو
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خبری رہی

(۴)

کافر ہوا ہوں رشتۂ زنّار کی قسم
تجھ زُلفِ حلقہ دار کے ہر تار کی قسم

ہرگز مریضِ عشق کو بن وصل نئیں علاج
اس کی ادا کی نرگسِ بیمار کی قسم

تیرے لبوں کی یاد نے ٹکڑے کیا ہے دل
ہے ذوالفقارِ حیدرِ کرار کی قسم
درشن دِکھا کے آتشِ غم کو مرے بجھا
میں تشنہ لب ہوں درشنِ دیدار کی قسم
اس گلبدن کے شوق سے گلشن میں اے سراجؔ
گلزار لالہ زار ہے گلزار کی قسم

درد

خواجہ میر نام۔ دردؔ تخلص۔ سنہ ۱۷۲۱ء میں دلّی میں پیدا ہوئے
آپ کے والد صاحب رسیدہ بزرگ اور فارسی کے شاعر تھے۔
اُن کی تربیت سے دردؔ میں فقیرانہ اور صوفیانہ رنگ پیدا
ہوا۔ آپ فقیر دل اور درویش صفت بزرگ تھے۔ عبادت،
ریاضت اور صبر توکّل کی وجہ سے بڑی عزت کی نگاہ سے
دیکھے جاتے تھے۔ دلّی کی تباہی کے بعد جہاں تقریباً سارے کے
سارے معززین دلی سے ہجرت کر گئے وہاں دردؔ اللہ پر بھروسہ
کئے اپنے بزرگوں کے سجادہ پر بیٹھے رہے۔ دردؔ کے کلام میں
عشق حقیقی اور تصوّف کے مسائل سلاست اور روانی کے
ساتھ ملتے ہیں۔

آپ کا انتقال سنہ ۱۷۸۵ء میں ہوا۔

۵

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اُس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

غافل! خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

یا رب یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں
دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

اخفائے رازِ عشق نہ ہو آبِ اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

مستِ شرابِ عشق وہ بیخود ہے جس کو حشر
اے دردؔ چاہے لائے بہ خود پر نہ لا سکے

---

(۶)

تہمتیں چند اپنے ذمّے دھر چلے
کس لئے آئے تھے اور کیا کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام اُن گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے اِدھر اُودھر چلے

شمع کے مانند ہم اس بزم سے
چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

جوں شرارِ ہستیٔ بے بود یاں
بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

میر تقی نام۔ میر تخلص۔ سنہ ۱۷۲۴ء میں اکبرآباد (آگرہ)
میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی زندگی میں خانِ آرزو کے ساتھ
دلی میں رہے۔ دلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ آئے۔ اُمراء
اور نواب نے قدردانی کی۔ میر کی زندگی ناکامیوں اور
دربدریوں کی زندگی ہے۔ کچھ آپ بیتی اور کچھ جگ بیتی کے
اثرات نے مل ملاکر میر کے دل کو رنج و غم سے بھر دیا۔ بے حد
خوددار اور تنک مزاج تھے۔ کلام میں رنج و الم کی
فراوانی، سوز و گداز اور درد و اثر ہے۔ اُردو کے
غزل گو شعراء میں سب سے اہم مقام کے مالک ہیں۔
آپ کا انتقال سنہ ۱۸۲۵ء میں لکھنؤ میں ہوا۔

۷

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع، کیا پتنگ، ہر اک بے حضور تھا

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھی کسو کا سرِ پُر غرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

(۸)

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لُٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی بس وہیں دیکھو
آئینہ کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میرِ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

آتش

خواجہ حیدر علی نام۔ آتش تخلص۔ سنہ ۱۷۷۸ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ فقیرانہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اردو کے چوٹی کے شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آسان و موثر زبان میں بلند خیالات روانی اور جاذبیت کے ساتھ ادا کیے ہیں۔ آپ نے اردو غزل گوئی کو حسن و عشق کی غلط اور عامیانہ روش سے بہت حد تک پاک کیا۔ کلام میں روانی ہے۔ انداز بیان لطیف اور دلکش ہے۔

سنہ ۱۸۴۷ء میں وفات پائی۔

۹

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گُل سو زر بہ کف
قارُوں نے راستے میں لُٹایا خزانہ کیا

اُڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عمر
مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا؟

زینہ صبا کا ڈھونڈتی ہے اپنی مُشتِ خاک
بامِ بلند یار کا ہے آستانہ کیا!

چاروں طرف سے جلوۂ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا؟

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟

یوں مدّعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتشؔ غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

۱۰

مگر اس کو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے
اُلٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے
خوشی سے اپنی رُسوائی گوارا ہو نہیں سکتی
گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے
بگولے کی طرح کس کس خوشی سے خاک اُڑاتا ہوں
تلاشِ گنج میں جو سامنے ویرانہ آتا ہے
طلب دنیا کو کرکے زن مریدی ہو نہیں سکتی
خیالِ آبروئے ہمّتِ مردانہ آتا ہے
تماشہ گاہِ ہستی میں عدم کا دھیان ہے کس کو
کسے اس انجمن میں یادِ خلوت خانہ آتا ہے

ذوق

شیخ محمد ابراہیم نام ذوقؔ تخلص ۱۷۸۹ء میں دلی میں
پیدا ہوئے۔ عربی فارسی اور مختلف علوم کے ماہر تھے۔
بلند پایہ قصیدہ نگار تھے۔ زبان و بیان پر پوری قدرت
حاصل تھی۔ آپ بہادر شاہ ظفرؔ کے استاد اور اپنے
زمانے کے بہت ہی مقبول شاعر تھے۔

آپ کا انتقال ۱۸۶۲ء میں ہوا۔

(۱۱)

کسی مسکیں کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بدخواہ میں تھا مارنا یا چشم بد بیں میں
فلک پر ذوقؔ تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

(۱۲)

دانۂ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو
آئے ہے جزو میں نظر کل کا تماشا ہم کو

ہم سفر ہو نہ سکا کوئی بھی اپنا لیکن
جادہ پہنچانے گیا تا لبِ دریا ہم کو

نہ اُٹھیں شورِ قیامت سے بھی وہ مست ہیں ہم
کہیے جب تک کہ نہ قم قم لبِ مینا ہم کو

جا بجا نام تو جوں نقشِ قدم چھوڑ گیا
خاک گم ہو کے گیا ڈھونڈنے عنقا ہم کو

واہ قسّامِ ازل صدقے ہم اس قسمت کے
جامِ عشرت اُسے اور داغِ تمنا ہم کو

ذوقِ بازیچۂ طفلاں ہے سراسر یہ زمیں
ساتھ لڑکوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو

مرزا اسد اللہ خاں نام غالبؔ تخلص ۱۷۹۶ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے - ذوقؔ اور مومنؔ کے ہم عصر تھے - اپنے زمانے میں صرف خواص میں مقبول تھے - لیکن اب آپ کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے - آپ کی شاعری میں زندگی کے اسرار و رموز بہت شوخی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں - جدّتِ فکر اور بلندیٔ خیال بے مثال ہے - اُردو خطوط نویسی میں ایک نئے طرز کے مالک ہیں -

۱۸۶۹ء میں دلی میں انتقال ہوا -
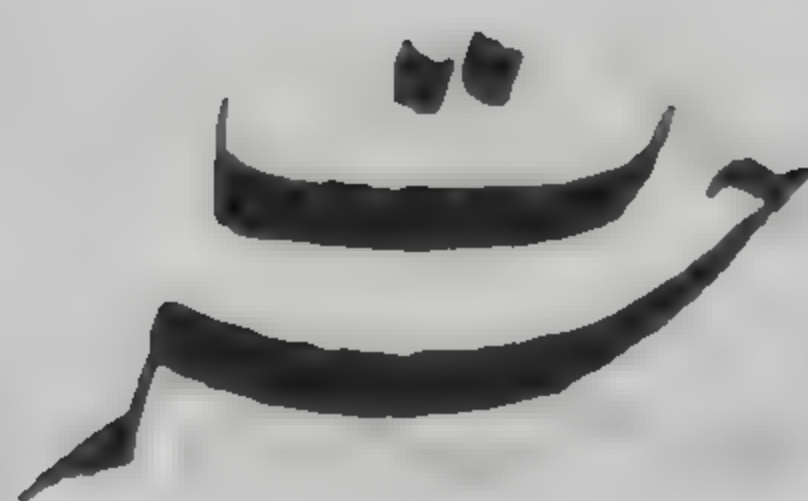
سید فضل الحسن نام۔ حسرتؔ تخلص۔ ۱۸۷۵ء میں قصبہ موہان ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ مشہور سیاست داں اور شاعر تھے۔ جدید غزل کے احیاء کا سہرا حسرتؔ کے سر ہے۔ درد و اثر، شیرینی اور دلکشی، عشقیہ احساسات وجذبات کی تصویر کشی حسرتؔ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

آپ کا انتقال ۱۹۵۱ء میں ہوا۔

(۱۹)

تجھ سے ہے حسن و جمالِ دو جہاں کی رونق
اے تری یاد مرے خانۂ جاں کی رونق

جاگزیں جب سے ہوئی تیری محبّت دل میں
بڑھ گئی اور بھی اس جنسِ گراں کی رونق

کیا نہیں شوقِ شہادت کو یہ کافی اعزاز
کہ مرا سر ہے ترے نوکِ سناں کی رونق

یاد میں اس گلِ رعنا کے جو نکلے آنسو
بن گئے دیدۂ خوننابہ فشاں کی رونق

شعر سے تیرے ہوئی مصحفی و میر کے بعد
تازہ حسرت اثر و حسنِ بیاں کی رونق

(۲۰)

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے دردِ محبت سے ساز باز کرے

اُمیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرتؔ
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

منظومات

سوؔدا

مرزا محمد رفیع نام سودا تخلص ۱۷۱۳ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ دلّی سے ہجرت کرکے فرخ آباد اور فیض آباد پھر لکھنؤ پہنچے۔ نواب آصف الدولہ نے قدر دانی کی۔ شاعری میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ تمام اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ آپ کا کلام نازک خیالات، بندش کی چستی، سلاست روانی اور فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ ہے۔

۱۷۸۱ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

(۱)

ہجو اسپ لاغر

ناطاقتی کا اس کی کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اس کی اب میں کہاں تک کروں شمار

مانندِ نقشِ نعل، زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اُٹھ سکے گا وہ گر بیٹھے ایک بار

اس مرتبے کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گزار

قصّاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد
اُمّیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بیقرار

سمجھا نہ جاوے وہ کہ یہ ابلق ہے یا سرنگ
خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار

تنہا نہ اس کے غم سے ہے دل تنگ زین کا
خو گیر کا بھی سینہ جو دیکھا تو ہے فگار
حشری ہے اس قدر کہ بجشر اس کے پشت پر
دجّال اپنے مُنہ کو سیہ کر کے ہو سوار
اتنا وہ سرنگوں ہے کہ سب اُڑ گئے ہیں دانت
جبڑے پہ بسکہ ٹھوکروں کی زنت پڑی ہے مار
ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سِن
پہلے وہ لے کے ریگ بیاباں کرے شُمار
لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنّت سے ہو سوار

(۲)

موسمِ سرما

سردی اب کی برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

ان دنوں چرخ پر نہیں ہے مہر
گود میں کا نگڑی رکھے ہے سپہر
کہرہ پڑنے کو کہتے ہیں سب یار
ٹھنڈے سے ہے جہاں کے دل میں غبار
لیک دیکھا جو غور سے میں آپ
نکلے ہے منھ سے آسماں کے بھاپ
پانی پر جس جگہ کہ کائی ہے
سبزہ شال کی رضائی ہے
صرصر صبح جان کھوتی ہے
تیر سی دل کے پار ہوتی ہے
باد سے دانت کھڑکے ہے اس بھانت
کہے تو باجتے ہیں دانت سے دانت
بے حرارت ہیں سردی کے مارے
طرح یاقوت کے اب انگارے
کفر کی مے سے مست ہے جو ہے
غرض آتش پرست ہے جو ہے

گر کسی مہر وش کو دیکھے ہے
شیخ بھی اپنی آنکھیں سینکے ہے

دن کی کٹتی ہے دھوپ میں اوقات
کالے کمبل میں رات کاٹے ہے رات

شب جو رخشندگی پہ برق آوے
ابر میں یوں ٹھٹھر کے رہ جاوے

کیا کروں اس کی یارو میں تقریر
جوں کسوٹی پہ سونے کی ہو لکیر

فرطِ سرما سے دیکھیے جس کو
دست زیرِ بغل ہے مثلِ سبو

لپٹے رہتے ہیں روئی میں مجبور
جس طرح ناشپاتی و انگور

اہلِ حرفہ کو کیجیے جو نگاہ
کاروبار ان کا ہو گیا ہے تباہ

پیٹ کر سر، رکھے ہے بھٹیارا
ہائے اب کیا کروں، میں بیچارا

سقّا بولے ہے بھر کے آنکھوں میں اشک
یارو پانی نکالو چیر کے مشک
غرض ایسی ہی کچھ پڑی ہے ٹھنڈ
مِٹ گیا زمہریر کا بھی گھمنڈ
سوداؔ آخر ہے سردی کا مذکور
شعر بھی گرخنک ہوں، رکھ معذور
آگے جاتا نہیں ہے اب بولا
ہو گئی ہے زبان بھی "اولا"

نظیر

ولی محمد نام نظیر تخلص۔ ۱۷۳۵ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ لیکن اکبر آباد (آگرہ) میں مقیم ہو گئے۔ مختلف ہندی بولیوں سے واقف تھے۔ نیک دل، فقیر منش، انسان دوست ظریف اور بذلہ سنج تھے۔ چھوٹے بڑے، امیر غریب، ہندو مسلمان سب سے اچھے تعلقات تھے۔ نظیر کی شاعری اس حیثیت سے امتیازی رنگ کی حامل ہے کہ اس کی بنیاد اُردو کے دوسرے شعرا کے برعکس تجربات اور مشاہدات پر ہے۔ اخلاق، تصوّف، منظر مشاہدہ اور زندگی کے مسائل کو سیدھے سادے اور رواں انداز میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

۱۸۳۰ء میں وفات پائی۔

مَرد

جو فقر میں پورے ہیں وہ ہر حال میں خوش ہیں
ہر کام میں ہر دام میں ہر جال میں خوش ہیں
گر مال دیا یار نے تو مال میں خوش ہیں
بے زر جو کیا تو اسی احوال میں خوش ہیں
——— افلاس میں ادبار میں اقبال میں خوش ہیں ———
——— پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں ———

چہرے پہ ملامت نہ جگر میں اثرِ غم
ماتھے پہ کہیں چین نہ ابرو میں کہیں خم
شکوہ نہ زباں پر نہ کبھی چشم ہوئی نم
غم میں بھی وہی عیش الم میں بھی وہی دم
——— ہر بات ہر اوقات ہر افعال میں خوش ہیں ———
——— پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں ———

گر یار کی مرضی ہوئی سر جوڑ کے بیٹھے
گھر بار چھڑایا تو وہیں چھوڑ کے بیٹھے
موڑا جدھر ان کو وہیں منہ موڑ کے بیٹھے
گدڑی جو سلائی تو وہی اوڑھ کے بیٹھے

—— گر شال اوڑھائی تو اسی شال میں خوش ہیں ——
—— پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں ——

گر اس نے دیا غم تو اسی غم میں رہے خوش
گر اس نے جو ماتم دیا ماتم میں رہے خوش
کھانے کو ملا کم تو اسی کم میں رہے خوش
جس طور کہا اس نے اس عالم میں رہے خوش

—— دُکھ درد میں آفات میں جنجال میں خوش ہیں ——
—— پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں ——

جینے کا نہ اندوہ نہ مرنے کا ذرا غم
یکساں ہیں انھیں زندگی و موت کا عالم
واقف نہ برس سے نہ مہینے سے وہ اِکدم
نے شب کی مصیبت نہ کبھی روز کا ماتم

——— دن رات گھڑی پہر مہ و سال میں خوش ہیں ———

——— پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں ———

گر اُس نے اوڑھایا تو لیا اوڑھ دوشالا

کمّل جو دیا تو وہی کاندھے پہ سنبھالا

چادر جو اوڑھائی تو وہی ہو گئی بالا

بندھوائی لنگوٹی تو وہیں ہنس کے کہا، لا

——— پوشاک میں دستار میں رومال میں خوش ہیں ———

——— پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں ———

کچھ ان کو طلب گھر کی نہ باہر سے انھیں کام

تکیہ کی نہ خواہش ہے نہ بستر سے انھیں کام

استھل کی ہوس دل میں نہ مندر سے انھیں کام

مفلس سے نہ مطلب نہ تونگر سے انھیں کام

——— میدان میں بازار میں چوپال میں خوش ہیں ———

——— پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں ———

ان کے تو جہاں میں عجب عالم ہیں نظیرؔ آہ

اب ایسے تو دنیا میں ولی کم ہیں نظیرؔ آہ

کیا جانے فرشتے ہیں کہ آدم ہیں نظیر آہ
ہر وقت میں ہر آن میں خرم ہیں نظیر آہ
جس ڈھال میں رکھا وہ اسی ڈھال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

(۴)

کلجگ

دُنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی سات لے
نیکی کا بدلہ نیک ہے بد سے بدی کی بات لے
میوہ کھلا میوہ ملے پھل پھول دے پھل پات لے
آرام دے آرام لے دُکھ درد دے آفات لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہات دے اُس ہات لے

کانٹا کسی کے مت لگا گر مثلِ گُل پھولا ہے تو
وہ تیرے حق میں تیر ہے کس بات پر بھولا ہے تو

مت آگ میں ڈال اور کو پھر گھاس کا پولا ہے تو
سُن رکھ یہ نقط بے خبر کس بات پر بھولا ہے تو
—— کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے ——
—— کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہات دے اُس ہات لے ——

شوخی شرارت مکروفن سب کا بسیکھا ہے یہاں
جو جو دکھایا اور کو وہ آپ دیکھا ہے یہاں
کھوٹی کھری جو کچھ کہ ہے تِسکا پریکھا ہے یہاں
جو جو پڑا تلنا ہے دل تل تل کا لیکھا ہے یہاں
—— کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے ——
—— کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہات دے اُس ہات لے ——

جو اور کی بستی رکھے اس کا بھی بستا ہے پُرا
جو اور کے مارے چھُری اس کے بھی لگتا ہے چھُرا
جو اور کی توڑے دُھری اس کا بھی ٹوٹے ہے دُھرا
جو اور کی چیتے بدی اس کا بھی ہوتا ہے بُرا
—— کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے ——
—— کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے ——

جو اور کو پھل دیوے گا وہ بھی سدا پھل پاوے گا
گیہوں سے گیہوں جَو سے جَو چاول سے چاول پاوے گا
جو آج دیوے گا یہاں ویسا وہ واں کل پاوے گا
کل دیوے گا کل پاوے گا کلپاوے گا کلپاوے گا
—— کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے ——
—— کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے ——

تو اور کی تعریف کر تجھ کو ثنا خوانی ملے
کر مشکل آساں اور کی تجھ کو بھی آسانی ملے
تو اور کو مہمان کر تجھ کو بھی مہمانی ملے
روٹی کھلا روٹی ملے پانی پلا پانی ملے
—— کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے ——
—— کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے ——

کر چک جو کچھ کرنا ہے اب یہ دم تو کوئی آن ہے
نقصان میں نقصان ہے احسان میں احسان ہے
تہمت میں یاں تہمت لگے طوفان میں طوفان ہے
رحمان کو رحمان ہے شیطان کو شیطان ہے

—— کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے ——
—— کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے ——

یاں زہر دے تو زہر لے شکّر میں شکّر دیکھ لے
نیکوں کو نیکی کا مزہ موذی کو ٹکّر دیکھ لے
موتی دیئے موتی ملے پتھّر میں پتھّر دیکھ لے
گر تجھ کو یہ باور نہیں تو تو بھی کر کر دیکھ لے

—— کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے ——
—— کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے ——

اپنے نفع کے واسطے مت اور کا نقصان کر
تیرا بھی نقصاں ہووے گا اس بات پر تو دھیان کر
کھانا جو کھا تو دیکھ کر پانی پیئے تو چھان کر
یاں پاؤں کو رکھ پھونک کر اور خوف سے گذران کر

—— کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے ——
—— کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے ——

غفلت کی یہ جاگہ نہیں یاں صاحبِ ادراک رہ
دل شاد رکھ دل شاد رہ غمناک رکھ غمناک رہ

ہر حال میں تو بھی نظیر اب ہر قدم کی خاک رہ
یہ وہ مکان ہے او میاں یاں پاک رہ بیباک رہ
کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے

غالب

آپ کے حالاتِ زندگی اور کلام کی خصوصیات صفحہ ۲۸ پر درج ہیں۔ غالب نے غزل کے علاوہ قصیدے اور قطعات بھی لکھے ہیں اور ان صنفوں میں بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

(۵)

در صفتِ انبہ

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخلِ طرب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے
ثمر و شاخ گوئے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں
آئے یہ گوئے اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جائے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو تمھیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گُل اُس میں نہ شاخ و برگ نہ بار
جب خزاں آئے تب ہو اُس کی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں
جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی
کوہکن باوجودِ غمگینی
جان دینے میں اس کو یکتا جان
پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
کہ دواخانۂ ازل میں مگر
آتشِ گُل پہ قند کا ہے قوام
شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغِ جنّت سے

انگبیں کے بحکم ربّ النّاس
بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات
مدّتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس
رنگ کا زرد پر کہاں بو باس
آم کو دیکھتا اگر یک بار
پھینک دیتا طلائے دست افشار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا
نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ
طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم
نازپروردۂ بہار ہے آم

(۶)

گذارشِ احوالِ واقعی

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

آزاد رو ہوں اور مرا مسلک ہے صُلحِ کُل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

اُستادِ شہ سے ہو مجھے پُرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اُس سے مّدعا
جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہِ امتثال امر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبّت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

حالی

خواجہ الطاف حسین نام حالؔی تخلص۔ ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ شیفتہ اور غالبؔ سے مستفیض ہوئے۔ لاہور میں گورنمنٹ بکڈپو میں ملازم تھے۔ سرسیّد کی تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ کچھ دن دلّی کالج میں پروفیسر رہے۔ پھر حیدرآباد سے وظیفہ ملنے لگا اور ملازمت ترک کرکے پانی پت میں ادبی خدمت کرتے رہے۔ تمام عمر قوم، ملک اور زبان کی خدمت میں بسر کی۔ حالؔی جدید اُردو ادب کے امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تصنیف "مسدّس حالی" بیداریٔ ملّت کی ایک اہم کڑی ہے۔

انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔

(۷)

شعاعِ اُمّید

مشابہ ہے قوم اس مریضِ جواں سے
کیا ضعف نے جس کو مایوس جاں سے
نہ بستر سے حرکت نہ جنبش مکاں سے
اجل کے ہیں آثار جس پر عیاں سے
—— نظر آتے ہیں سب مرض جس کے مزمن ——
—— نہیں کوئی مہلک مرض اس کو لیکن ——
بجا ہیں حواس اس کے اور ہوش قائم
طبیعت میں میلِ خور و نوش قائم
دماغ اور دل چشم اور گوش قائم
جوانی کا پندار اور جوش قائم
—— کرے کوئی اس کی اگر غور کامل ——
—— عجب کیا کہ ہو جائے زندوں میں شامل ——

عیاں سب پہ احوال بیمار کا ہے
کہ تیل اس میں جو کچھ تھا سب جل چکا ہے
موافق دوا ہے نہ کوئی غذا ہے
ہُزالِ بدن ہے زوالِ قویٰ ہے
مگر ہے ابھی یہ دیا ٹمٹماتا
بُجھا جو کہ ہے یاں نظر سب کو آتا
یہ سچ ہے کہ ہے قوم میں قحط انساں
نہیں قوم کے ہیں سب افراد یکساں
سفال و خزف کے ہیں انبار گر یاں
جواہر کے ٹکڑے بھی ہیں ان میں پنہاں
چھپے سنگریزوں میں جوہر بھی ہیں کچھ
ملے ریت میں ریزۂ زر بھی ہیں کچھ
جو بے غم ہیں ان میں تو غمخوار بھی ہیں
جو بے ہنر ہیں کچھ تو کچھ یار بھی ہیں
انھیں غافلوں میں خبردار بھی ہیں
خرابات میں چند ہشیار بھی ہیں

—— جماعت سے اپنی نرالے بھی ہیں ہاں ——
—— نکمّوں میں کچھ کام والے بھی ہیں یاں ——
جو چاہیں پلٹ دیں یہی سب کی کایا
کہ ایک اک نے ملکوں کو ہے یاں جگایا
اکیلوں نے ہے قافلوں کو بچایا
جہازوں کو ہے زور قوں نے ترایا
—— یونہی کام دُنیا کا چلتا رہا ہے ——
—— دیئے سے دیا یونہی جلتا رہا ہے ——
یہ سچ ہے کہ ہیں بیشتر ہم میں ناداں
نہیں جن کے دردِ تعصّب کا درماں
جہاں میں ہیں جو اُن کی عزّت کے خواہاں
انھیں سے وہ رہتے ہیں دست و گریباں
—— پہ ایسے بھی کچھ ہوتے جاتے ہیں پیدا ——
—— کہ جو خیر خواہوں پہ ہیں اپنے شیدا ——
کوئی خیر خواہی میں ہے ہمسر اُن کا
کوئی دست و بازو سے ہے یاور اُن کا

کوئی ہے زباں سے ستائش گر ان کا
بہت رکھتے ہیں نقشِ حُب دل پر ان کا
بہت ان کے گُن سنتے ہیں چپکے چپکے ——
بہت ہیں جو سر دُھنتے ہیں چپکے چپکے ——

بہت دن سے دریا کا پانی کھڑا تھا
تموّج کا جس میں نہ ہرگز پتا تھا
تغیّر سے یہ حال اس کا ہوا تھا
کہ مکروہ بو تھی تو کڑوا مزا تھا
ہوئی تھی یہ پانی سے زائل لطافی ——
کہ مشکل سے کہہ سکتے تھے اس کو پانی ——

پہ اَب اس میں رَو کچھ کچھ آنے لگی ہے
کناروں کو اس کے ہلانے لگی ہے
ہوا بلبلے کچھ اٹھانے لگی ہے
عفونت وہ پانی سے جانے لگی ہے
اگر ہو نہ یہ انقلاب اتفاقی ——
تو دریا میں بس اک تموّج ہے باقی ——

(۸)

نشانِ اقبال مندی

الپ ارسلاں سے یہ طغرل نے پوچھا
کہ "قومیں ہیں دنیا میں جو جلوہ فرما
نشان اُن کی اقبال مندی کے ہیں کیا
کب اقبال منداُن کو کہنا ہے زیبا"
کہا "ملک و دولت ہو ہاتھ ان کے جب تک
جہاں ہو کمر بستہ ساتھ ان کے جب تک
جہاں جائیں وہ سرخرو ہو کے آئیں
ظفر ہم عناں ہو جدھر باگ اٹھائیں
نہ بگڑیں کبھی کام جو وہ بنائیں
نہ اُکھڑیں قدم جس جگہ وہ جمائیں
کریں مس کو گر مس تو وہ کیمیا ہو
اگر خاک میں ہاتھ ڈالیں طلا ہو"

ولیعہد کی جب کہ باتیں سنیں یہ
ہنسا سُن کے فرزانۂ دوربیں یہ
کہا "جانِ عم! گپ ہے گو دل نشیں یہ
مگر شرطِ اقبال ہرگز نہیں یہ

—— حوادث سے بن گزارہ نہیں یاں ——
—— بلندی و پستی سے چارہ نہیں یاں ——

بہم ہے کبھی گاہ برہم ہے محفل
کٹھن ہے کبھی گاہ آساں ہے منزل
زمانہ کی گردش سے بچنا ہے مشکل
نہ محفوظ ہیں اس سے مدبر نہ مقبل

—— بہت یکہ تازوں کو یاں گھرتے دیکھا ——
—— سدا شہسواروں کو یاں گرتے دیکھا ——

جہاں سود ہے یاں وہیں ہے زیاں بھی
جہاں روشنی ہے وہیں ہے دھواں بھی
سفر بھی ہے یہ خاکداں اور جناں بھی
بہاریں بھی ہیں اس چمن میں خزاں بھی

——— نکھرتے ہیں جو یاں وہ گدلانے کبھی ہیں ———

——— چمکتے ہیں جو یاں وہ گہناتے کبھی ہیں ———

ضعیف اور قوی الرمنی اور عراقی

چکھاتا ہے دُردِ قدح سب کو ساقی

پہ اقبال کی ہے رمز جن میں باقی

یہ سب تلخیاں ان میں ہیں اتفاقی

——— بلاؤں میں گِھر کر نکل جاتے ہیں وہ ———

——— ذرا ڈگمگا کر سنبھل جاتے ہیں وہ ———

نہیں ہوتے نیرنگ گردوں سے حیراں

ہر اک درد کا ڈھونڈ لیتے ہیں درماں

اٹھاتے نہیں کچھ حوادث سے نقصاں

وہ چونک اُٹھتے ہیں دیکھ خواب پریشاں

——— بھڑکتے ہیں انسردہ ہو کر سوا وہ ———

——— بھبکتے ہیں پژمردہ ہو کر سوا وہ ———

پگھلتے ہیں سانچے میں ڈھلنے کی خاطر

لگاتے ہیں غوطہ اُچھلنے کی خاطر

ٹھہرتے ہیں دم لیکے چلنے کی خاطر
وہ کھاتے ہیں ٹھوکر سنبھلنے کی خاطر
سبب کو مرض سے سمجھتے ہیں پہلے
اُلجھتے ہیں پیچھے سلجھتے ہیں پہلے

ضرورت نہیں یہ کہ فرمانروا ہوں
رعیت ہوں وہ خواہ کشور کشا ہوں
سپاہی ہوں تاجر ہوں یا ناخدا ہوں
کچھ حال پر اپنے سے واقف ذرا ہوں
کہ ہم کیا ہیں اور کون ہیں اور کہاں ہیں
گھٹے یا بڑھے ہیں سُبک یا گراں ہیں

جب آئے انھیں ہوش کچھ وقت کھو کر
رہیں بیٹھ قسمت کو اپنی نہ رو کر
کریں کوششیں سب بہم ایک ہو کر
رہیں داغ ذلت کا دامن سے دھو کر
نہ ہو تاب پرواز اگر آسماں تک
تو واں تک اڑیں ہو رسائی جہاں تک

پڑا ہے وہی وقت اب ہم پہ آکر
کہ اٹھے ہیں سوتے بہت دن چڑھا کر
سوار دن نے کی راہ طے باگ اٹھا کر
گئے قافلے ٹھہر منزل پہ جا کر

گر افتاں و خیزاں سدھارے بھی اب ہم
تو پہنچے بھلا جا کے منزل پہ کب ہم

مگر بیٹھ رہنے سے چلنا ہے بہتر
کہ ہے اہل ہمت کا اللہ یاور
جو ٹھنڈک میں چلنا نہ آیا میسر
تو پہنچیں گے ہم دھوپ کھا کھا کے سر پر

یہ تکلیف و راحت ہیں سب اتفاقی
چلو اب بھی ہے وقت چلنے کا باقی

ہوا کچھ وہی جس نے یاں کچھ کیا ہے
لیا جس نے پھل بیج بو کر لیا ہے
کرو کچھ کہ کرنا ہی کچھ کیمیا ہے
مثل ہے کہ کرتے کی سب بدّیا ہے

یونہی وقت سو سو کے ہیں جو گنواتے
وہ خرگوش کچھوؤں سے ہیں زک اٹھاتے

اسماعیل میرٹھی

محمد اسماعیل نام سنہ ۱۸۴۴ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔
آپ نے اخلاقی اور نیچرل نظمیں لکھی ہیں۔ نصاب کی کتابیں
ترتیب دی ہیں۔ بچوں کے لئے آسان اور سہل زبان میں
چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھیں۔ منظر نگاری میں کمال رکھتے تھے۔
سنہ ۱۹۱۷ء میں انتقال فرمایا۔

(۹)

قلعۂ اکبر آباد

یارب یہ کسی مشعلِ کشتہ کا دھواں ہے
یا گلشنِ برباد کی یہ فصل خزاں ہے
یا برہمیٔ بزم کی فریاد و فغاں ہے
یا قافلۂ رفتہ کا پسِ خیمہ رواں ہے
ہاں دورِ گذشتہ کی وجاہت کا نشاں ہے
بانیٔ عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے
—— اُڑتا تھا یہاں پرچمِ جم جاہیٔ اکبر ——
—— بجتا تھا یہاں کوسِ شہنشاہیٔ اکبر ——

وہ قصرِ معلّیٰ کہ جہاں عام تھا دربار
آئینہ نما صاف ہیں جس کے در و دیوار
اور سقف زر اندوز ہے مانندِ چمن زار
اور فرش ہے مرمر کا مگر چشمۂ انوار

اب بانگِ نقیب اس میں نہ چاؤش کی للکار
سرہنگِ کمربستہ نہ وہ مجمعِ حشّار
کہتا ہے کبھی مرکزِ اقبال تھا میں بھی
ہاں قبلہ گہِ عظمت و اجلال تھا میں بھی

وہ چتر وہ دیہیم وہ سامان کہاں ہیں
وہ شاہِ ذوقرنین وہ خاقان کہاں ہیں
وہ بخشی وہ دستور وہ دیوان کہاں ہیں
خدّامِ ادب اور وہ دربان کہاں ہیں
وہ دولتِ مغلیّہ کے ارکان کہاں ہیں
فیضی و ابوالفضل سے اعیان کہاں ہیں
سنسان ہے وہ شاہ نشیں آج صد افسوس
ہوتے تھے جہاں خان و خواتین زمیں بوس

وہ بارگہِ خاص کی پاکیزہ عمارت
تاباں تھے جہاں نیرِ شاہی و وزارت
بڑھتی تھی جہاں نظم و سیاست کی مہارت
آتی تھی جہاں فتحِ ممالک کی بشارت

بیوں شحنۂ معزول پڑی ہے وہ اکارت
سیّاح کیا کرتے ہیں اب اس کی زیارت
کہتا ہے سخن فہم ہے یہ کتبہ دروں کا
تھا مخزنِ اسرار یہی تاج وروں کا

ہاں کس لئے خاموش ہے او بخت جگر ریش
کس غم میں سیہ پوش ہے؟ کیا سوگ ہے درپیش
کملی ہے ترے دوش پہ کیوں صورتِ درویش
جوگی ہے ترا پنتھ کہ صوفی ہے ترا کیش

بولا کہ زمانے نے دیا نوش کبھی نیش
صدیاں مجھے گذری ہیں یہاں تین کم و بیش
صدقے کبھی مجھ پر گہر و لعل ہوئے تھے
شاہانِ معظّم کے قدم میں نے چھوئے تھے

درشن کے جھروکے کی پڑی تھی یہیں بنیاد
ہوتی تھی تُلا دان میں کیا کیا دہش وداد
وہ عدل کی زنجیر ہوئی تھی یہیں ایجاد
جو سمع شہنشاہ میں پہنچاتی تھی فریاد

وہ نور جہاں اور جہاں گیر کی افتاد
اس کا رخِ ہمایوں کو بہ تفصیل ہے سب یاد
ہر چند کہ بیکار یہ تعمیر پڑی ہے
قدر اس کی مورّخ کی نگاہوں میں بڑی ہے

اب دیکھئے وہ مسجد و حمّام زنانہ
وہ نہر وہ حوض اور وہ پانی کا خزانہ
صنعت میں ہر اک چیز ہے یکتا و یگانہ
ہے طرزِ عمارت سے عیاں شانِ شہانہ
کیا ہو گئے وہ لوگ کہاں ہے وہ زمانہ
ہر سنگ کے لب پر ہے غم اندوز ترانہ
چغتائیہ گلزار کی یہ فصل خزاں ہے
ممتاز محل ہے نہ یہاں نور جہاں ہے

وہ دور ہے باقی نہ وہ ایّام وصالی
جو واقعہ حسّی تھا سو ہے آج خیالی
ہر کنگرۂ شکستہ دیوان ہر اک منزلِ عالی
عبرت سے ہے پُر اور مکینوں سے ہے خالی

آقا نہ خداوند اہالی نہ موالی
بجز ذاتِ خدا کوئی نہ وارث ہے نہ والی
—— یہ جملہ محلّات جو سنسان پڑے ہیں ——
—— پتھر کا کلیجہ کئے سنسان کھڑے ہیں ——

(۱۰)

گرمی کا موسم

مئی کا آن پہنچا ہے مہینہ
بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ
بجے بارہ تو سورج سر پہ آیا
ہوا پیروں تلے پوشیدہ سایا
چلی لُو اور تڑاتے کی پڑی دھوپ
لپٹ ہے آگ کی گویا کڑی دھوپ
زمیں ہے یا کوئی جلتا توا ہے
کوئی شعلہ ہے یا پچھوا ہوا ہے

درو دیوار ہیں گرمی سے تپتے
بنی آدم ہیں مچھلی سے تڑپتے
پرندے اُڑ کے ہیں پانی پہ گرتے
چرندے بھی ہیں گھبرائے سے پھرتے
درندے چھپ گئے ہیں جھاڑیوں میں
مگر ڈوبے پڑے ہیں کھاڑیوں میں
نہ پوچھو کچھ غریبوں کے مکاں کی
زمیں کا فرش ہے چھت آسماں کی
امیروں کو مبارک ہو حویلی
غریبوں کا بھی ہے اللہ بیلی

سُرود

درگا سہائے نام سرور تخلص۔ سنہ ۱۸۷۳ء میں جہان آباد ضلع پیلی بھیت میں پیدا ہوئے۔ زندگی نے وفا نہ کی پھر بھی سرور اردو شاعری میں کافی بلند مقام رکھتے ہیں۔ منظر نگاری اور واقعہ نگاری ان کی شاعری کا اصل جوہر ہے۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں ۳۳ برس کی عمر میں رحلت فرمائی۔

(۱۱)

موسمِ بہار کا آخری گُلاب

یہ آخری گلاب کا ہے یادگار پھول
بیکس غریب، فرقتِ احباب میں ملول
اور شاخ پر کھلا ہوا تنہا چمن میں ہے
دُھندلا سا اِک چراغِ سحر انجمن میں ہے
ہے کوئی غم گسار نہ ہمدم کوئی قریب
رخصت ہوئے چمن سے رفیقانِ ہمنشیں
بچپن کے آشنا ہیں نہ وہ خانداں کے پھول
بکھرے پڑے ہیں خاک پہ اب گلستاں کے پھول
ننھی سی کوئی آہ کلی بھی نہیں قریب
کچھ دردِ دل کا حال کہے جس سے غم نصیب
ڈالے جو عکس پھول سے رُخ کا غریب پر
جو اس کی آہ سرد کو سُن کر ہو نوحہ گر

کمھلانے دوں گا تجکو میں تنہا نہ شاخ پر
احباب سو رہے ہیں جہاں تیرے خاک پر
ڈر ہے نہ کنج میں تری مٹی خراب ہو
جا بھی اور ان کے ساتھ ہم آغوشِ خواب ہو
کب تک زباں پہ فرقتِ احباب کا گلا
ہیں محوِ خوابِ مرگ جہاں تیرے آشنا
اب تیری پتیاں ہیں بچھاتا ہوں خاک پر
تجکو بھی ان کے ساتھ سلاتا ہوں خاک پر
رخصتِ سفر اٹھاؤں گا میں بھی جہاں سے جلد
چھوڑوں گا مر کے ہجر کے دردِ نہاں سے جلد
احباب مجھ سے جب مرے ہو جائیں گے جدا
تنہا کوئی جہاں میں جیا بھی تو کیا جیا ؟
کیا لے کے کوئی آہ کرے عمرِ جاوداں
یارانِ رفتہ کا ہے زیارت کدہ جہاں
سلکِ وفا میں جب نہ رہے دُرِّ آبدار
میری بھی بے کسی کا بنے گا وہیں مزار

(۱۲)

نیا سال اور نئی اُمّیدیں

صُبحِ بہار لے کر پھولوں کا ہار آئی
دوشِ صبا پہ نکہت ہو کر سوار آئی
پہلو میں پھر مسرّت بن کر نگار آئی
مُردہ دلوں کے قالب میں جانِ زار آئی

پھر سالِ نَو نویدِ عیشِ دوام لایا
نوروز پھر خوشی کا ہم کو پیام لایا

دوشِ اُفق پہ سورج نوروز کا پھر آیا
پھیلا کے اپنی کرنیں ذرّوں کو جگمگایا
پھر صبحِ آرزو نے جلوہ ہمیں دکھایا
خوابیدگانِ شب کو پھر نیند سے جگایا

پھر جوشِ حُبِّ قومی اٹھا امنگ ہو کر
آئی وطن کی اُلفت دل میں ترنگ ہو کر

کونپل نئی نکالی ہر نخلِ بوستاں نے
بدلا بہار کا پھر جوڑا نیا خزاں نے
دَورِ کہن کو پلٹا پھر گردشِ جہاں نے
چھیڑا نیا ترانہ یارانِ نکتہ داں نے

پھر سالِ نو کے مقدم کا غل ہے انجمن میں
نوروز کا ہے طوطی پھر بولتا چمن میں

کروٹ بدل رہا ہے سبزہ کنارِ جو پھر
پھولوں میں بھینی بھینی ہے عطر کی سی بو پھر
نوروز کے ہے لب پر بلبل کی گفتگو پھر
شاخوں پہ ہیں چہکتے مرغانِ خوش گلو پھر

آئی بہارِ تازہ پھر باغِ آرزو میں
نزہت بھری ہوئی ہے پھولوں کی رنگ و بو میں

دورِ نشاطِ گردوں پھر دورِ جامِ جم ہے
پھر خارزارِ ہستی گلدستۂ ارم ہے
خاموش انجمن ہیں بانگِ خروشِ غم ہے
اٹھو کہ سونے والو فرصت کا وقت کم ہے

—— دل کو نئی اُمنگیں پھر گُدگُدا رہی ہیں ——

—— پھر سالِ نو کی خوشیاں ہمّت بڑھا رہی ہیں ——

خوابِ گراں سے چونکو ہندوستان والو

پستی میں کیوں پڑے ہو اونچے نشان والو

کب تک یہ آہ ذلّت اے عزّ و شان والو

کب تک یہ خوابِ غفلت سونے کی کان والو

—— خُلدِ بریں کے جھونکے تم کو جگا رہے ہیں ——

—— رحمت کے آسماں سے پیغام آ رہے ہیں ——

اُٹھ کر ذرا تو دیکھو دنیا کا رنگ کیا ہے؟

رفتارِ کیا جہاں کی قوموں کا ڈھنگ کیا ہے؟

ہے حفظ و ضبط کیا شے ناموس و ننگ کیا ہے؟

ایثارِ نفس کیا ہے قومی اُمنگ کیا ہے؟

—— قومی ترقیوں کا کچھ تو ہے راز آخر ——

—— حبِّ وطن میں کر دو دل کو گداز آخر ——

———

اقبال

شیخ محمد اقبال نام۔ سنہ ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔
لاہور سے ایم۔اے، جرمنی سے پی۔ایچ۔ڈی اور لندن سے بیرسٹری
پاس کی۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ اقبال سیاسی، ملّی
اور وطنی شاعری کے لئے مشہور ہیں۔ زندگی اور انسانیت کے مسئلوں
پر گہری نظر رکھتے تھے۔ دورِ حاضر کے مفکرین میں ایک ممتاز مقام
کے مالک اور اپنی شاعری اور عالمانہ افکار کی وجہ سے عالمگیر
شہرت کے حامل ہیں۔

سنہ ۱۹۳۸ء میں انتقال فرمایا۔

(۱۳)

چاند اور تارے

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے
تارے کہنے لگے قمر سے
نظّارے رہے وہی فلک پر
ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا
چلنا، چلنا، مدام چلنا
بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے
کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کشِ سفر سب
تارے، انساں، شجر، حجر سب
ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا؟
منزل کبھی آئے گی نظر کیا؟

کہنے لگا چاند ہم نشینو!
اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے

(۱۴)

انسان

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے
انسان کو راز جُو بنایا
راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوق آگہی کا
کھلتا نہیں بھید زندگی کا

حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

ہے گرم خرام موجِ دریا
دریا سوئے بحر جادہ پیما
بادل کو ہوا اُڑا رہی ہے
شانوں پہ اُٹھائے لا رہی ہے
تارے مستِ شرابِ تقدیر
زندانِ فلک میں پا بہ زنجیر
خورشید وہ عابدِ سحر خیز
لانے والا پیامِ "برخیز"
مغرب کی پہاڑیوں میں چھپکر
پیتا ہے مئے شفق کا ساغر
لذّت گیرِ وجود ہر شئے
سر مستِ مئے نمود ہر شئے
کوئی نہیں غمگسارِ انساں!
کیا تلخ ہے روزگارِ انساں!

چکبست

برج نرائن نام۔ چکبست خاندانی لقب۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ چکبست کا کلام اُردو شاعری میں بلند مرتبہ کا حامل ہے۔ آپ نے غزلیں اور نظمیں دونوں ہی لکھیں۔ آپ کی نظمیں آزادی اور حب وطن کے جذبات سے لبریز ہیں۔ قدرتی مناظر کی تصویر کشی، سلاستِ اثر اور زورِ بیان آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

سنہ ۱۹۲۶ء میں وفات پائی۔

(۱۵)

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حُسنِ ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزّ و شاں ہے

ہر صُبح ہے یہ قدرت خورشیدِ پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جس سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیِٔ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقہ کیا وطن کو
اکبر نے جامِ اُلفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب سورَ بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا اُن کی ہڈیاں ہیں
دیوار و در سے اب تک اُن کا اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں اب تک اُن کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوسِ گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ ابتک
اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں
کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں
پستی سی آگئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

—— گُل شمعِ انجمن ہے، گو انجمن وہی ہے ——
—— حُبِّ وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے ——

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا
دُنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا
اِک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

—— علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں ——
—— عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں ——

اے صُورِ حُبِّ قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سُنا دے
مُردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

—— حُبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر ——
—— سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر ——

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک
رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک

بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک
ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا
آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرہ اس منزلِ کہن کا
تلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

(۱۶)

قوم کی لڑکیوں سے خطاب

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز

نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و رفاہ

تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں

ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز

خود جو کرتے ہیں زمانے کی روش کو بدنام

ساتھ دینا نہیں ایسوں کا زمانہ ہرگز

پوجنے کے لئے مندر جو ہے آزادی کا

اس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز

کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو

دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز

نغمۂ قوم کی لَے جس میں سما ہی نہ سکے

راگ ایسا کوئی ان کو نہ سکھانا ہرگز

گو بزرگوں میں تمہارے نہ ہوا اس وقت کا رنگ

ان ضعیفوں کو نہ ہنس ہنس کے رُلانا ہرگز

ہم تمھیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں

تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

شبیر حسن خاں نام جوش تخلص ۱۸۹۴ء میں ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ کچھ دن حیدرآباد میں ملازم رہے۔ آزادی کے بعد حکومت ہند کے اُردو رسالہ "آجکل" کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آج کل پاکستان میں ہیں۔ جوش دَورِ حاضر کے باکمال شاعروں میں ہیں۔ زبان اور بیان پر جو قدرت آپ کو حاصل ہے، گذشتہ اور موجودہ شعراء میں بہت کم کو میسّر ہے۔ آپ نے آزادی اور انقلاب کے مضامین بڑے جوش سے نظم کئے ہیں۔

(۱۷)

البیلی صُبح

نظر جھکائے عروسِ فطرت، جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں، اُفق کی لَو تھرتھرا رہی ہے
روش روش نغمۂ طرب ہے، چمن چمن جشنِ رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں، کلی کلی گنگنا رہی ہے
طیور بزمِ سحر کے مُطرب، لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیمِ فردوس کی سہیلی، گُلوں کو جھولا جھُلا رہی ہے
کلی پہ بیلے کی کس ادا سے، پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں، یہ ہیرے کی کیل پہنے، کوئی پری مُسکرا رہی ہے
فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں، ہلال کے گرد پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی، جبیں سے افشاں چھُڑا رہی ہے

(۱۸)

نوجوانوں سے خطاب

مانگ لی نسوانیت سے تم نے یہ شیریں ادا
مرحبا اے نازک اندامانِ کالج مرحبا

ناز سے نیچی نگاہیں چال اٹھلائی ہوئی
جنگ سر پر اور یہ محبوبیت چھائی ہوئی

نازکی کا مقتضا پتلی چھڑی باندھے ہوئے
شوقِ کنگن کا کلائی پر گھڑی باندھے ہوئے

جنگ اور نازک کلائی بیچ میں تقدیر کے
مُڑ نہ جائے گی نگوڑی بوجھ سے شمشیر کے

دیر سے توپوں کا مُنہ کھولے ہوئے ہے روزگار
سینۂ گیتی میں ہے جس کی دھمک سے خلفشار

شغلِ زینت سے تمھیں فرصت مگر ملتی نہیں
کیا تمھارے پاؤں کے نیچے زمیں ہلتی نہیں

(۲)

مرد کہتے ہیں اسے اے مانگ چوٹی کے غلام
جس کے ہاتھوں میں ہو طوفانِ عناصر کی لگام
مرد کی تخلیق ہے زور آزمانے کے لیے
گردنِ سرکش حوادث کی جھکانے کے لئے
مرد ہے سیلاب کے اندر اکڑنے کے لئے
بحر کی بپھری ہوئی موجوں سے لڑنے کے لئے
دوڑتا شعلہ جو ہو بجلی کا دامن تھامنے
مسکراتا ہو گرجتے بادلوں کے سامنے
مضحکہ کرتا ہو خوں آشام تلواروں کیساتھ
کھیلتے ہوں جس کے پہلو سُرخ انگاروں کے ساتھ
تم مگر اس زندگی کے کھیل سے رہتے ہو دُور
آفریں اے عصرِ حاضر کے "جوانانِ غیور"

جمیل

میر کاظم علی نام جمیلؔ تخلص ۱۹۰۵ء میں خلیوزہ (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ میٹرک سے لے کر ایم۔ اے تک کی تعلیم کلکتہ یونیورسٹی میں حاصل کی۔ ایک عرصہ تک کلکتہ کے روزناموں میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۷ء میں بہار میں شعبۂ اطلاعات میں اُردو کے پبلسٹی آفیسر مقرر ہوئے۔ فی الحال پٹنہ یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو میں لکچرار ہیں۔

اُردو غزل اور نظم دونوں ہی میں انفرادی خصوصیتوں کے مالک ہیں۔ زمانۂ حال کے اُردو شعرا میں جدّتِ فکر، خوبیٔ بیان اور تنوّع مضامین کے لحاظ سے کامیاب ہیں۔

۱۹

ارتقار

ہر حال میں مشیّت مجھ کو بنا رہی ہے
میں اس کی قدرتوں کا شہکار بن رہا ہوں
خود اپنی جنتوں کی تخلیق کر رہا ہوں
خود اپنی زندگی کا معمار بن رہا ہوں
یہ جبر و قدر کی اک منزل ہے درمیانی
مجبور تو ہوں لیکن مختار بن رہا ہوں

یہ راہ وہ ہے جس میں ہر سانس اک سفر ہے
منزل بھی راستہ ہے لغزش بھی راہبر ہے

حکمت کی رہبری میں پرواز کی امنگیں
امکاں کے دائروں کو پھیلا کے بڑھ رہی ہیں
وہ قوتیں جو اب تک تحت شعور میں تھیں
گہوارۂ خودی میں پروان چڑھ رہی ہیں

انجام کی بصیرت خواہش پہ حکمراں ہے
آزادیاں خود اپنی زنجیر گڑھ رہی ہیں
پکڑے ہوئے ہیں دامن گو خیر و شر ہمارا
پابندیوں میں بھی ہے جاری سفر ہمارا

جذبات رفتہ رفتہ افکار بن رہے ہیں
افکار کا نتیجہ کردار بن رہا ہے
ہمدردیوں کی شدت انصاف بن رہی ہے
پروردگی کا جذبہ ایثار بن رہا ہے
لغزش سے تجربہ ہے اور تجربہ سے حکمت
تخلیق ہو رہی ہے معیار بن رہا ہے
گمراہیوں سے ہو کر ہے راستہ ہمارا
تاریخ بن رہا ہے ہر نقشِ پا ہمارا

(۲۰)

دعوتِ عزم

اے مردِ بصیرت کھول آنکھیں سب جاگ چکے تو سوتا ہے
اٹھ دیکھ! کہ تیری دنیا میں کیا ہوتا تھا کیا ہوتا ہے

یہ عالمِ کیف و کم یعنی یہ سود و زیاں کی آبادی
اک ماتمِ عیشِ ماضی ہے جس طرح خزاں کی آبادی
سورج کا مُنہ کچھ اُترا ہے فطرت کا دل کچھ بھاری ہے
اندر کی خدائی میں ہر سو فرمانِ سیاہی جاری ہے
کچھ بھیگی بھیگی رہتی ہیں پچھلے سے فضائیں صحرا کی
رحمت کا فرشتہ روتا ہے قسمت پہ ہماری دنیا کی
صد چاک ہوس کے ہاتھوں سے انسانیّت کا جامہ ہے
اک شورش ہے، اک ہلچل ہے، اک لوٹ ہے اک ہنگامہ ہے
پھُنکتا ہے صُور قیامت کا، اُچٹی ہے نیند زمانے کی
مغرب سے صدائیں آتی ہیں، جنگی باجوں کے بجانے کی
اک آگ لگی ہے دنیا میں گرد اُڑتی ہے، لو چلتی ہے
مغرب سے لے کر مشرق تک آدم کی کھیتی جلتی ہے
اب وقت نہیں ہے سونے کا اے غفلت کے پالو جاگو
اے ہند کے فرزندو جاگو، اے نیند کے متوالو جاگو
جس آگ کی لپٹوں نے بڑھ کر تہذیب کا دامن پکڑا ہے
اخلاق کے خرمن پھونکے ہیں فطرت کا کلیجہ جھلسا ہے

اسس آگ کے شعلے تمام چکے بھارت ماتا کے آنچل
اُمید کی نظریں ڈھونڈتی ہیں رحمت کے برستے بادل
اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے رحمت کی گھٹا بن جاؤ
رحمت کی گھٹا بن جاؤ تم، شاعر کی دعا بن جاؤ
ایک ایسا عزم دکھانا ہے، تہذیب کے اس گھارے کو
جو موڑ دے اپنی طاقت سے سیلاب کے سرکش دھارے کو
وہ عزم مزاجِ آہن خود جس کے سانچے میں ڈھلتا ہے
وہ عزم کہ جس کی گرمی سے تلوار کا لوہا گلتا ہے

منثورات

میر امان علی نام امن تخلص۔ دلی میں پیدا ہوئے۔
احمد شاہ درانی کے حملے کے زمانے میں دلی سے عظیم آباد
ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر جان
گلکرسٹ کی سرپرستی میں ادبی خدمت میں لگ گئے۔
۱۸۰۱ء میں "باغ و بہار" تصنیف کی۔ باغ و بہار کی عبارت
سلیس، رواں اور بامحاورہ ہے۔ ہندی الفاظ نہایت خوبی
سے استعمال ہوتے ہیں۔ عبارت کا رنگ ایسا ہے جیسے کوئی
باتیں کرتا ہے۔ جذبات کو حفظ مراتب کے ساتھ بڑی خوبی سے
ادا کیا ہے۔ کردار نگاری کی بھی کہیں کہیں جھلک موجود ہے۔
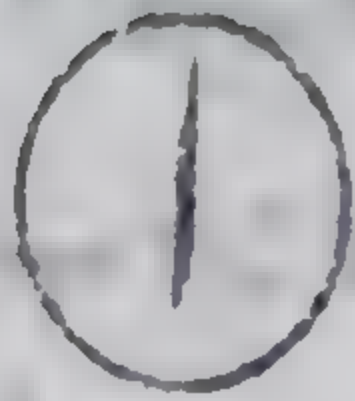
سیر پہلے درویش کی

اے یاران! میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملک یمن ہے والد اس عاجز کا ملک التجار خواجہ احمد نام بڑا تاجر تھا اس وقت کوئی مہاجن یا بیوپاری ان کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے مقرر تھے۔ خرید و فروخت کے لئے لاکھوں روپیہ نقد اور جنس ملکوں ملکوں کی گھر میں تھی۔ ان کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے ایک تو یہی فقیر جو کفنی اور سیلی پہنے ہوئے مرشدوں کے حضور میں حاضر ہے اور بولتا ہے اور دوسری ایک بہن جس کی قبلہ گاہ نے اپنی زندگی میں ایک سوداگر بچہ سے شادی کر دی تھی وہ اپنی سسرال میں رہتی تھی۔ غرض جس کے گھر میں اتنی دولت اور ایک لڑکا ہو اس کے لاڈ اور پیار کا کیا کہنا ہے۔ مجھ فقیر نے بڑے چاؤ چو چلے سے ماں باپ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی اور پڑھنا لکھنا اور سپہ گری

کا کسب و فن سوداگری کا کہی تو درو زنا مچہ سیکھنے لگا چودہ برس
بے فکری سے گزرے کچھ دنیا کا اندیشہ دل میں نہ آیا۔ یک بیک ایک
ہی سال میں والدین مر گئے۔ عجب طرح کا غم ہوا جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔
یکبارگی یتیم ہو گیا۔ کوئی بڑا بوڑھا سر پر نہ رہا۔ اس مصیبت ناگہانی
سے رات دن رویا کرتا تھا کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ جوں توں
کر کے چہلم کیا اپنے بیگانے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ سے فراغت پائی
سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا دنیا میں سب کے
ماں باپ مرتے آئے ہیں اور اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے۔ بس صبر
کرو اور اپنے گھر کو دیکھو اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے۔ اپنے
کار بار لین دین سے ہوشیار رہو۔ تسلی دے کر وہ تو رخصت ہوئے
گماشتے کاروباری نوکر چاکر جتنے تھے آکر حاضر ہوئے نذریں دیں اور
بولے کوٹھے نقد و جنس کے اپنی نظروں سے دیکھ لیجیے۔ میری نگاہ میں
یکبارگی اس دولت پر پڑی آنکھیں کھل گئیں دیوانخانہ کی تیاریوں کا
حکم دیا۔ فراشوں نے فرش بچھا کر چھت پردے چلمنیں تکلف کی لگا دیں
اور اچھے اچھے خدمتگار نوکر رکھے۔ ان کی زرق برق پوشاکیں
بنوائیں۔ فقیر مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھا ویسے ہی آدمی گنڈے بھانڈ
مفت [illegible] کھانے پینے والے جھوٹے خوشامدی آن کر مصاحب
بنے ان سے آٹھ پہر صحبت رہنے لگی۔ ہر طرح کی واہی تباہی

باتیں کرتے اور کہتے اس جوانی کے عالم میں کتنکی شراب یا گل گلاب کھنچوایئے نازنین معشوقوں کو بلوا کر انکے ساتھ پیجیئے اور عیش کیجئے۔ غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ ہر دم کے کہنے سننے سے اپنا مزاج بھی بہک گیا۔ شراب، ناچ رنگ اور جوئے کا چرچا ہوا۔ پھر تو یہ نوبت پہنچی کہ سوداگری بھول کر تماش بینی اور دینے لینے کا سودا گر ہوا۔ اپنے نوکر اور رفیقوں نے جب یہ حالت دیکھی جو جس کے ہاتھ لگا الگ کیا گویا لوٹ مچادی۔ مجھے خبر نہ تھی کہ کتنا روپیہ صرف ہوتا ہے اور کہاں سے آتا اور کدھر جاتا ہے مال مفت دلِ بے رحم۔ اس فضول خرچی کے آگے اگر گنج قارون بھی ہوتا تو وفا نہ کرتا۔ کئی برس کے عرصہ میں ایک بارگی یہ حالت ہوئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ دوست آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچہ بھر خون اپنا ہر بات میں نثار کرتے تھے کافور ہو گئے۔ بلکہ راہ باٹ میں اگر ملاقات ہو جاتی تو آنکھیں چرا کر منہ پھیر لیتے اور نوکر چاکر خدمتگار بہلے ڈلیت خاص بردار ثابت خانے سب چھوڑ کر کنارے لگے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔ اب دمڑی کی ٹھڈیاں نہیں جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے تڑاقے کے گذر گئے تب بھوک کی تاب نہ لا سکا۔ ناچار بے حیائی کا برقع منہ پر ڈال کر یہ قصد کیا کہ بہن کے یہاں چلئے لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ والد کی وفات

کے بعد نہ بہن سے سلوک کیا نہ خالی خط لکھا بلکہ اس نے دو تین خط ماتم پرسی اور اشتیاق کے لکھے ان کا جواب بھی اس خواب خرگوش میں نہ دیا۔ اس شرمندگی سے دل تو نہ چاہتا تھا مگر سوائے اس کے اور کوئی ٹھکانا بھی نظر نہیں آتا تھا۔ جوں توں خالی ہاتھ گرتا پڑتا ہزار محنت سے کئی منزل کاٹ کر ہمشیرہ کے شہر میں جاکر اس کے مکان میں پہنچا وہ ماں جائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لینے لگی اور گلے مل کر بہت روئی۔ تل، کالے ماش مجھ پر سے صدقہ کئے اور کہنے لگی اگرچہ ملاقات سے دل خوش ہوا لیکن بھیّا یہ تیری کیا صورت بنی۔ اس کا جواب کچھ نہ دے سکا۔ بلکہ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چپکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی سے ایک پوشاک سلوا کر حمام میں بھیجا۔ میں نے نہا دھو کر کپڑے پہنے ایک مکان پُر تکلّف اپنے پاس میرے رہنے کے لئے مقرر کیا۔ صبح کو شربت اور نوریات، حلوہ سوہن، پستہ مغزی ناشتہ کو۔ تیسرے پہر کو میوے خشک و تر پھل پھلاری کھلاتی اور رات دن دونوں وقت پلاؤ نان قلیے کباب تحفہ و مزیدار منگوا کر اپنے روبرو کھلاتی۔ اس طرح خاطر داری کرتی میں اس طرح کا آرام پاکر خدا کی درگاہ میں سجدہ شکر بجالایا۔ کئی مہینے اسی فراغت سے گذرے کہ پاؤں اس خلوت سے باہر نہ رکھا۔ ایک دن وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر کرتی تھی کہنے لگی اے بیرن تو

میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں خوش ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے پیدا کیا ہے۔ گھر میں بیٹھا رہنا ان کو لازم نہیں، جو مرد نکھٹو ہو کر گھر بیٹھا رہتا ہے لوگ اس کو طعنہ دیتے ہیں۔ خصوصاً اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے تمہارے بے سبب بیٹھے رہنے پر کہیں گے کہ ماں باپ کا مال کھو کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آپڑا۔ نہایت بے عزتی اور میری تمہاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو لاج لگنے کا سبب ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تمہیں پہناؤں اور کلیجہ میں بٹھاؤں۔ اب یہ صلاح ہے کہ سفر کرو خدا چاہے دن پھریں اور حیرانی پریشانی و مفلسی کے بدلے دلجمعی اور خوشی حاصل ہو۔ یہ بات سن کر مجھے بھی غیرت آئی۔ اس کی نصیحت پسند کر کے جواب دیا اچھا تم اب ماں کی جگہ ہو جو کہو سو کروں۔ میری مرضی پا کر گھر میں پچاس توڑے اشرفیوں کے اصیل و لونڈیوں کے ہاتھ لوا کر میرے آگے رکھے اور بولی سوداگروں کا ایک قافلہ دمشق کو جاتا ہے تم ان روپیوں سے جنس تجارت کی خرید کر کے ایک تاجر ایماندار کے حوالے کر کے دستاویز لکھوا لو اور آپ بھی دمشق کا قصد کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو اپنا مال مع منافع سمجھ بوجھ لو۔ میں وہ نقد لے کر

لے کر بازار میں گیا۔ اسباب سوداگری کا خرید کر کے ایک سوداگر کے سپرد کیا اور نوشت وخواند سے فراغت پاکر وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ اور فقیر نے خشکی کی راہ اختیار کی۔ جب رخصت ہونے لگا تو بہن نے ایک بھاری جوڑا اور ایک گھوڑا جڑاؤ ساز سے مرصع تواضع کیا اور ایک خاصدان میں مٹھائی بھر کر ہرنے سے لٹکا دی اور چھاگل پانی کی شکاربند میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا۔ دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگایا۔ آنسو پی کر بولی سدھارو تم کو خدا کو سونپا پیٹھ دکھا کر جاتے ہو اسی طرح منہ دکھاتے جلد آنا۔ میں نے فاتحہ پڑھ کر کہا اللہ تمہارا بھی حافظ ہے میں نے قبول کیا۔ وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور توکل پر بھروسہ کر کے دو منزل کی راہ ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔ غرض جب شہر کے دروازے پر پہنچا بہت رات جا چکی تھی۔ دربان اور نگہبانوں نے دروازہ بند کر لیا تھا میں نے بہت منت کی کہ مسافر ہوں دور سے دھاوا مارے آتا ہوں کواڑ کھول دو تو شہر میں جا کر دانہ گھاس کا انتظام کروں۔ وہ اندر سے گھڑک کر بولے اس وقت دروازہ کھولنے کا حکم نہیں ہے اتنی رات گئے تم کیوں آئے۔ جب میں نے ان سے صاف جواب سنا تو شہر پناہ کی دیوار کے تلے گھوڑے سے اتر کر زین پوش بچھا کر بیٹھا۔

سرور

مرزا رجب علی بیگ نام سرورؔ تخلص سنہ ۱۷۸۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی میں کافی مہارت تھی۔ خطاطی، موسیقی اور شاعری میں بھی دخل تھا۔ واجد علی شاہ والی لکھنؤ کی تباہی کے بعد آپ بنارس چلے آئے

فسانۂ عجائب آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ عبارت مُقفّیٰ اور مرصّع ہے۔ البتہ اس میں جا بجا تصنع اور آورد ہے۔

سنہ ۱۸۶۸ء میں بمقام بنارس انتقال فرمایا۔

(۲)

تباہیٔ جہاز کے بعد جانِ عالم کا جوگی کے پاس آنا

تباہیٔ جہاز کے بعد جانِ عالم تختے کے سہارے سے ڈوبتا ترتا چار دن میں کنارے لگا۔ جب تکان پانی کی موقوف ہوئی غش سے آنکھ کھلی۔ دیکھا کنارے گیا ہوں بلکہ گور کے کنارے لگ رہا ہوں بڑی جد و کد سے اترا۔ آہستہ آہستہ بیٹھتا اٹھتا ایک طرف چلا۔ ایک بستی میں پہنچا۔ وہاں کے باشندے اُس کا چہرہ اور رجال یہ خراب حال دیکھ کر بہت گھبرائے۔ قریب آئے۔ پاس آ کچھ خوف سا کھا یوں اس طرح بولے کہ سچ کہو تم کون ہو۔ جانِ عالم نے دمِ سرد دل اندوہگیں سے بچشمِ تر کر لوگوں سے کہا۔ رباعی

حالے دارم چناں کہ دشمن خواہد ۔۔۔ جانے دارم کہ فرقتِ تن خواہد
ناکامیِ خویش اگر شرح دہم ۔۔۔ دشمن بخدا زندگی من خواہد

ایہاالنّاس میں گم کردہ کارواں جرس کی طرح نالاں ہوں۔ دل گرفتہ

نقشِ پائے یاراں ہوں۔ حمق میں گرفتار ہوں۔ بچھڑوں کا طالب دیدار ہوں۔ غریب دیار بے تاب۔ دانہ نصیب ہوا نہ آب۔ مفارقت یاران چند سے خستہ و خراب۔ حیران ہوش و حواس ایک لغت زائل۔ ضعف سدِ راہ ناطاقتی حائل۔ یاروں کی صورت نظر آئی نہیں۔ دیدۂ دیدار طلب میں بینائی نہیں۔ نہ تابِ رفتار۔ نہ طاقت گفتار۔ اشعار

بسان نقشِ پا بیٹھے جہاں واں سے نہ پھر سرکے
ٹھکانا پوچھتے ہو کیا بھلا ہم بے ٹھکانوں کا

بیادِ دوستاں پہروں مجھے ہچکی لگ آتی ہے
کہیں مذکور حبیب ہوتا ہے کچھ گذشتے فسانوں کا

علم سے آہ کے ثابت ہوئی غم کی ظفر ہم کو
کہ باعث فتح کا ہوتا ہے کھل جانا نشانوں کا

چھڑائے جبر سے پیر فلک نے دوست سب میرے
مٹے گا داغ کب دل سے مرے اُن نوجوانوں کا

شررہ مُنہ سے نکلتے ہیں سر ورِ دل حزیں ہردم
بھلا دیواں ہو کیوں کر جمع ہم آتش بیانوں کا

اس حکایت جاں سوز۔ شکایت چرخ بے مہر غم اندوز سے سب رونے لگے۔ کہا یہ شاہزادۂ عالی تبار ہے الآ دل از دست دادہ۔ مجنوں دُور اُفتادہ۔ اس سبب سے دل افگار ہے۔ منّت و سماجت سے مکان

لے گئے۔ ہاتھ منہ دُھلوا کھانا پانی حاضر کیا۔ جان عالم آب و طعام دیکھ کر رو دیا۔ یہ کہا خدا جانے میرے بچھڑوں کا کیا حال ہوا۔ کسی کو دانہ پانی میسر آیا یا کچھ نہیں پایا۔ میں بھی نہ کھاؤں گا۔ بھوکا پیاسا مر جاؤنگا۔ وہ بولے حضرت سلامت کھانے پانی سے انکار نادانی ہے۔ اسی سے بشر کی زندگانی ہے۔ جو جیتے ہو کسی روز بچھڑوں سے مل جاؤگے۔ وگرنہ غربت کے مر جانے میں گور و کفن بھی نہ پاؤ گے۔ ناچار سب کے سمجھانے سے دو ایک نوالے حلق سے اُتارے۔ پانی جو پیالہ تھا پاؤں سنسناے پیہم غش آئے۔ جب طبیعت ٹھہری سب حال پُر ملال جہاز کی تباہی۔ انیسان ہمراز کی جُدائی۔ اپنا ڈوبتے اُچھلتے وہاں تک آنا۔ اوروں کا پتہ نہ پانا۔ بیان کر کے یہ کہا۔ **شعر**

ہمرہاں رفتند و ماماندیم و دندان در زمیں
خانۂ ملّاح در چین است و کشتی در فرنگ

سب تاسف کرنے لگے۔ ایک شخص نے کہا یہاں سے دو منزل ایک پہاڑ ہے کوہ مطلب برار نام ہے۔ اُس پر جوگی کا مقام ہے۔ مرد باکمال شیریں مقال۔ ہزاروں سے حاجت مند اس کے پاس جاتے ہیں۔ سب کے مطلب بر آتے ہیں۔ بسکہ اُس پر عنایت باری ہے چشمۂ فیض اس سے جاری ہے۔ مشہور ہے کہ آج تک کوئی شخص محروم و ناکام اس مقام سے نہیں پھرا۔ یہ مژدہ سُن کر چہرے پر بشاشت چھا گئی۔ گئی ہوئی

جان اسی آن بدن میں آگئی۔ گھبرا کر یہ شعر پڑھا۔ حافظ

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند ٭ آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

اسی دم چلنے کا عزم کیا۔ وہ لوگ مانع ہوئے۔ کہا ابھی جانے کی طاقت آپ میں آئی نہیں۔ پاؤں میں راہ چلنے کی تاب و توانائی نہیں۔ دو چار روز یہاں آرام کرو۔ قوت آجائے تو مختار ہو۔

غرض کہ جان عالم نے ان لوگوں کے سمجھانے سے وہاں مقام کیا۔ عجب پریشانی میں صبح کو شام کیا۔ آخرش وہ رات کی رات بہزار خفو بات تڑپ تڑپ کر سحر کی۔

جوگی کے استھان کا سین

سنگ سفید کے پہاڑ بہت آبدار مانند ہمت جوانان صاف باطن سربلند۔ اور مثال طبع سخنوران فرح افزا دل پسند ملے۔ فراخ کشادہ روشن۔ جوش نباتات و ریاحین و لالہ سے اور خروش مرغان خوش الحان سے رشک صد گلشن۔ چشمہائے شیریں جابجا فرہاد کی روح کا حصہ۔ ہر قسم کا میوہ درخت قدرت حق سے اُگا پھولا پھلا۔ پتھر ہر ایک معدن لعل۔ پرند و چرند صاحب جمال۔ یہ سیر دیکھتا چلا۔ ایک طرف درخت گنجان گھنے۔ پختہ مزار بیزار دلوں کے بنے۔ اور منڈھی کا گنبد گردان بے ستوں کا جواب بنا۔ ترسول گڑا کھاروے کی جھنڈی

پھر پھرا اڑتی ۔ کلمۂ شہادت بخط جلی لکھا۔ جب اس کے نزدیک آیا۔
دُور دور تک مکان صاف صحن شفاف پایا۔ مٹھ کے روبرو درخت
کے تلے چبوترے کے اوپر ایک جوگی ننو نسو برس کا سن سال۔ مگر
ٹانٹھا کمال ۔ ڈاڑھی ناف سے بڑی ۔ گرہ لگی ۔ جٹا ہر ایک راہ سے بھری ۔
قدمبوسی ہو رہی ۔ پاؤں پڑی ۔ پلکیں دیدۂ حق بیں کا اسرار چھپانے کو ۔ چشم
حاسد کے گزند بچانے کو ۔ موچھوں سے ملیں ۔ جسم میں موج دریا کی طرح بھریاں
پڑیں ۔ کمر میں کردھنی موٹی سی مہین بان کی ۔ عجب آن بان کی ۔ کھاروے
کا لنگوٹ ستر عورت کا اوٹ گلے میں محمودی کی کفنی ۔ حقّہ چوگانی منہ
سے لگائے ۔ افیونی کی شکل بنائے ۔ شیر کی کھال بچھائے ۔ بھبوت
رمائے ۔ دیدہ وادیدہ سے بظاہر آنکھیں بند ۔ مگر دیدۂ دل کھلا خموشی پسند ۔
دل بولتا ۔ سوتا نہ جاگتا ۔ آسن مارے ۔ دنیا سے کنارے بیٹھا ۔ پیٹ
پیٹھ لگا ۔ تیر سا قد راست مثل کمان خمیدہ ۔ گویا چلّہ کھینچ چکا ہے ۔ زنّار
آسا رگیں عیاں ۔ کھال سے ہڈیوں کے جوڑ شمع فانوس نمط نمایاں ۔ تسبیح
سلیمانی ایمان کی نشانی ہاتھ میں ۔ ہر گنجو گنجو نکمہ کلام بات میں ۔ قشقہ ٹیکا
ماتھے پر ہندوؤں کا سا ۔ اور سجدے کا گھٹا بدر کامل کی صورت چمکتا ۔
زرد مٹی بدن میں ۔ ذکر حق دل و دہن میں ۔ کہیں مصلے پر سجہ و سجادہ گا رکھی ۔
کپڑے کی جانماز بچھی ۔ کسی جا پوتھی کھلی ۔ دھونی رمی ۔ دونوں سے راہ
رکھی ۔ عجب رنگ کا انسان ۔ خلاصہ یہ کہ نہ ہندو نہ مسلمان بقول میرزا نوشا ۔

کس کی ملّت میں گنوں آپ کو بتلا اے شیخ
تو کہے گبر مجھے ۔ گبر مسلماں مجھ کو

ایک طرف تکئے میں دو چار کیاریاں ۔ بیلے چنبیلی کی بہار کلکاریاں ۔ کہیں کہیں مرشدوں کے ڈھیر گرد کی جھڑی بزرگوں کے مزاروں پر مولسری کے درخت سایہ دار قطار قطار ۔ درختوں کی ٹہنیوں میں پنجڑے لٹکتے ۔ جانور باہم بحث کرتے اٹکتے ۔ فاختہ کی کوکو ۔ قمری کی حق سرہو ۔ کوکلا کے دم ۔ سناٹے کا عالم ۔ کہیں مرگ چھالا بچھا ۔ شیر چیتے کی دیتا ۔ دھونی لگی ۔ لکڑ سلگتا ۔ کسی جابر کی کھال کا بستر ا ۔ آہوئے صحرائی اس پر بیٹھا ۔ اودا ساتو بنا ۔ ہمنتا دھرا ۔ ایک سمت بھوانی کا مٹھ ۔ تلسی کا پیڑ ہرا بھرا گرد چشمہ پانی کا ہرا بھرا ۔ جائے دلچسپ ۔ مکان رعب دار ۔ گل خود رو کی جدا بہار ۔ ایک طرف بھنڈارا جاری ۔ کڑھاؤ چڑھا ۔ موہن بھوگ ملتا ۔ کہیں پلاؤ قلیئے کی تیاری ۔ چھاند بٹ رہا تھا ۔ کچھ مہنت بالکے ۔ کچھ مرید مال کے ۔ کوئی چلّے میں بیٹھا ۔ کوئی دنیا سے ہاتھ اٹھائے کھڑا ۔ کسی کے خرقہ و تاج سر و تن میں ۔ کوئی چوالوں میں ۔ کہیں کتھا ہوتی ۔ کوئی وعظ کہہ رہا ۔ ایک طرف خنجری بجتی ۔ طنبور چھڑتا ۔ بھجن ہوتے ۔ ایک سمت حلقہ مراقبہ کا بندھا ۔ نوحہ پڑھ رہے ۔ لوگ روتے ۔ عجیب وہ گھر مرشد غریب ۔ یہ مرید چیلے ۔ روز ایک دو کو ڈھونڈنا ۔ تیسرے چوتھے دن عرس میلے ۔ حاصل کلام یہ کہ عجب جلسہ تھا ۔ کہ دیکھا نہ سنا ۔ یہ اجتماع نقیضین آرام و چین سے

شہزادے کے پاؤں کی آہٹ جو پائی مراد آگاہ دل روشن ضمیر نے پلک ہاتھ سے اُٹھائی۔ آنکھ ملائی۔ دیدے لال لال۔ چہرے پہ رعب وجلال۔ جانعالم کو بغور دیکھا۔ اُس نے جھک کر بادب سلام کیا۔ اس خوش تقریر شیریں مقال نے کہا۔ بھلا ہو بچّہ۔ بڑی مصیبت فلک نے دکھائی جو یہ صورت یہاں تک آئی۔ آؤ بیٹھو گرو بھلا کرے۔ مرشد کی دعا سے حق حاجت روا کرے۔ ہم تمہارے امانت دار ہیں۔ سواری کھڑی ہے چلنے کو تیار ہیں۔ جانعالم متعجب ہو رہا تھا اور زیادہ حیران ہوا کہ یہ کیا اسرار ہے۔ پاس جا بیٹھا۔ جوگی اُٹھا چشمے میں جا کر نہایا۔ گیروا چادرا پھینک سفید اوڑھ عطر لگا۔ جان عالم کے نزدیک آ بہ نکتہ زبان پہ لا۔ بابا ایک دن ذوق وشوق کے عالم میں ہمارے مرشد گرو نے تیرے حال سے خبر دی تھی۔ کہ ایک شہزادہ کا جہاز تباہ ہو جائے گا۔ وہ بسراغ مطلب یہاں آئے گا۔ اس کا کام تجھ سے تیرا کام اس کے سامنے پورا ہو جائے گا۔ اس بات کے سننے سے شہزادے کو نہایت مسرت ہوئی۔ کہا جوگی جی تمہارے نام سے میری زندگی کی صورت ہوئی۔ وگرنہ دو چار دن میں گریبان صبر چاک ہو جاتا۔ سر پٹک کر ہلاک ہو جاتا۔

غالب

آپ کے حالات صفحہ ۲۷ پر درج ہیں۔
آپ کا نثری کارنامہ خطوط کی شکل میں ہے۔ بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔
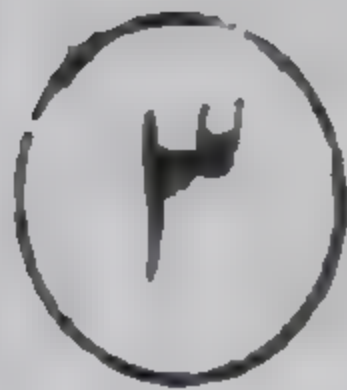
رقعاتِ غالب

بنام مولوی عبدالغفور خاں بہادر نساخ

جناب مولوی صاحب قبلہ۔ یہ درویش گوشہ نشین جو موسوم باسد اللہ اور متخلص بہ غالب ہے۔ مکرمت حال کا شاکر اور آئندہ افزائش عنایت کا طالب ہے۔ دفتر بے مثال عطیہ کبری اور موہبت عظمیٰ سمجھ کر یاد آوری کا احسان مانا۔ پہلے اس قدر افزائی کا شکر ادا کرتا ہوں کہ حضرت نے اس ہیچ میرز ہیچمداں کو قابل خطاب اور لائق عطار کتاب جانا۔ میں دروغ گو نہیں۔ خوشامد میری خو نہیں۔ دیوان فیض عنوان اسم بامسمیٰ ہے۔ دفتر بے مثال اس کا نام بجا ہے۔ الفاظ متین۔ معانی بلند۔ مضمون عمدہ۔ بندش دلپسند۔ ہم فقیر لوگ اعلان کلمۃ الحق میں بیباک و گستاخ ہیں۔ شیخ امام بخش طرزِ جدید کے موجد اور پرانے ناہموار روشوں کے ناسخ تھے۔ آپ ان

سے بڑھ کر یعنی مبالغہ بے مبالغہ نشان ہیں۔ تم دانائے رموز اردو
زبان ہو۔ سرمایۂ نازش فکر ہندوستان ہو۔ خاکسار نے ابتدائے سن
تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے۔ پھر اوسط عمر میں بادشاہ دہلی
کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثر
فارسی کا عاشق و مائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی
کا گھائل ہوں۔ جہاں تک زور چل سکا۔ فارسی زبان میں بہت
کچھ بکا۔ اب نہ فارسی کی فکر۔ نہ اردو کا ذکر۔ نہ دنیا میں توقع نہ
عقبیٰ کی امید۔ میں ہوں اور اندوہ ناکامی جاوید۔ جیسا کہ خود ایک
قصیدہ نعت کی تشبیب میں کہتا ہوں۔

چشم کشودہ اند بکردار پائے من   ز آیندہ ناامیدم و از رفتہ شرمسار

دیگر

میرے مشفق میرے شفیق مجھ سے ہیچ و پوچ کے ماننے والے مجھ سے بُرے
کو اچھا جاننے والے میرے محب میرے محبوب تم کو میری خبر بھی ہے آگے
ناتواں تھا اب نیم جان ہوں، آگے بہرا تھا اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔
رامپور کے سفر کا رہ آورد ہے رعشہ و ضعف بصر جہاں چار سطریں لکھیں
انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں۔ حرف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا بہت
جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں مہینوں کی اور دنوں کی ہے۔ پہلا خط تمہارا
پہنچا اُس سے تمہارا مریض ہونا معلوم ہوا متواتر معلوم ہوا دوسرا خط مع غزل

آیا اور غزل کو دیکھا۔ سب شعر اچھے اور لطیف تھے۔ حافظے کا یہ حال ہے غزل کی زمین یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ ایک شعر میں کوئی لفظ بدلا گیا تھا۔ غرض کہ وہ غزل بعد مشاہدہ تم کو بھیجی گئی اور لکھا گیا کہ نوید حصول صحت جلد بھیجو کل ایک خط۔ جسٹری دار آیا گویا ستارہ دنبالہ دار آیا حیران ما جرا کیا ہے۔ بارے کھولا اور دیکھا۔ خط نوید رفع مرض حصول صحت سے خالی اور شکوہ ہائے بیجا سے پر ہے۔ صاحب میرے نام کا خط جہاں سے روانہ ہو وہیں رہ جائے تو رہ جائے ورنہ دلی کے ڈاکخانہ میں پہنچ کر کیا مجال ہے جو مجھ تک نہ پہنچے۔ اسی طرح میرا خط یہاں کے ڈاکخانہ سے نہ روانہ ہو گیا یعنی جہاں پہنچے وہاں کے ڈاکخانہ کے کارپردازوں کو اختیار ہے مکتوب الیہ کو دیں یا نہ دیں۔ آپ مرزا صابر کا تذکرہ مانگتے ہیں اس کا یہ حال ہے کہ غدر سے پہلے چھپا اور غدر میں تاراج ہو گیا۔ اب ایک نسخہ اس کا کہیں نظر نہیں آتا۔ بس اب مجھے اتنا لکھنا باقی ہے کہ اس خط کی رسید اور اپنی خیر و عافیت جلد لکھو۔

جواب خط کا طالب غالب

صبح جمعہ ۲۵ ذی حجہ سنہ ۱۲۸۲ھ ۱۲ مئی سنہ ۱۸۶۶ء

سید احمد نام۔ ۱۸۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔
۱۸۴۱ء میں منصف ہوئے۔ ۱۸۵۵ء میں بجنور کے صدر امین مقرر
ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد آپ نے
ملت کی رہنمائی کی۔

ایک ماہر نثار اور کامیاب صحافی تھے۔ متعدد تصانیف
اردو میں چھوڑی ہیں۔ اردو ادب کے معماروں میں تھے۔
آپ کی عبارت تکلفات سے یکسر پاک ہے۔ نہایت
ہی سادگی اور صفائی سے اپنے خیالات ادا کرتے ہیں۔ سلیس
اور عام فہم نثر کو آپ کی تحریروں سے فروغ ہوا۔
۱۸۹۸ء میں انتقال کیا۔

گذرا ہوا زمانہ

برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے۔ آندھی بڑے زور سے چلتی ہے۔ دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے۔ مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے نہ اکیلے پن پر۔ اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر۔ اور نہ برس کی اخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے اتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بہے چلے جاتے تھے۔

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے۔ جب کہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر نہ تھی

دل میں نہ تھی۔ روپیہ اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر، ماں باپ، بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لئے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لئے مکتب چلا جاتا ہے۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا۔ اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا۔ ہائے وقت! ہائے وقت! ہائے گزرے ہوئے زمانے! افسوس میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا۔

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سُرخ سفید چہرہ، سڈول ڈیل، بھرا بھرا بدن، رسیلی آنکھیں، موتی کی لڑی سے دانت، امنگ بھرا ہوا دل۔ جذبات انسانی کے جوشوں کی خوشی اسے یاد آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے تو وہ یہ کہتا تھا کہ "آہ! ابھی وقت بہت ہے" اور بوڑھاپے کے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا۔ اور موت کے لئے تیار رہتا۔ آہ! وہ گزر گیا۔ آہ وقت گزر گیا! اب پچھتائے کیا ہوتا ہے۔ افسوس میں نے اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ "ابھی وقت بہت ہے"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی، دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے۔ ہولناک آندھی چل رہی ہے۔ درختوں کے پتے اڑ رہے ہیں۔ تب وہ چلا کر بولا "ہائے! ہائے! میری گذری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراؤنی ہے جیسی کہ یہ رات"۔ یہ کہہ کر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا، یاد آئے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے، آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے۔ یہ کہتی ہوئی کہ "ہائے بیٹا! وقت گذر گیا"۔ باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اس میں سے یہ آواز آتی ہے کہ "کیوں بیٹا! ہم تمہارے ہی بھلے کے لئے نہ کہتے تھے"؟ بھائی بہن دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے خاموش ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست، آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اب ہم کیا کر سکتے ہیں"۔

ایسی حالت میں اس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے نہایت بے پروائی اور بے مروتی اور کج خلقی سے اپنے ماں، باپ، بھائی بہن، دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ

رکھنا، باپ کو ناراض کرنا۔ بھائی بہن سے بے مروّت رہنا۔ دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا۔ اور اس پرانی گلی ہوئی بڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹا جاتا تھا اور یہ کہہ کر چلا اٹھتا تھا کہ "ہائے وقت نکل گیا! ہائے وقت نکل گیا! اب کیوں کر اس کا بدلہ ہو"؟

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اور ٹکراتا، لڑکھڑاتا، کھڑکی کی طرف پہنچا، اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے۔ اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے، پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔ اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑ پن یاد آیا جس میں نہ وہ جوانی ہی رہی تھی اور نہ وہ جوانی کا جوبن۔ نہ وہ دل رہا تھا، نہ دل کے ولولوں کا جوش۔ اس نے اپنے اس نیکی کے زمانے کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا، نمازیں پڑھنی، حج کرنا، زکوٰۃ دینی، بھوکوں کو کھانا کھلانا، مسجدیں اور کنوواں بنوانا یاد کر کے اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی، اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی تھی، اپنی مدد کو پکارتا تھا مگر دل کی بے قراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے

ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے۔ بھُوکے پیڑ ویسے ہی بھوکے ہیں۔ مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر ہیں یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنوئیں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اللہ نہ فقیر کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور وہ درد کرتا ہے۔ اسکا دل بہت گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا؟ جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی؟ اب کچھ بس نہیں چلتا۔ اور پھر یہ کہہ کر چلا اُٹھا۔ "ہائے وقت! ہائے وقت! میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا"؟

وہ گھبرا کر پھر گھر کی طرف دوڑا۔ اُن کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے۔ آندھی تھم گئی، گھٹا کھل گئی ہے۔ تارے نکل آئے ہیں۔ ان کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لیے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا ہے۔ یکایک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دُلہن نظر آئی۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آ گئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجے سے اس سے پوچھا کہ "تم کون ہو"؟ وہ بولی کہ "میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔" اس نے پوچھا کہ "تمہاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے"؟

وہ بولی ــ "ہاں ہے ۔ نہایت آسان، پر بہت مشکل ۔ جو کوئی خدا کا فرض ادا کرے، انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری میں سعی کرے اس کی میں مسخر ہوتی ہوں ۔ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے ۔ انسان ہی ایسی چیز ہے جو آخر تک رہے گا۔ پس جو بھلائی کر انسان کی بہتری کے لئے کی جاتی ہے، وہی نسل در نسل آخر تک چلی جاتی ہے ۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اسی تک ختم ہو جاتا ہے ۔ اس کی موت ان چیزوں کو ختم کر دیتی ہے ۔ مادی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں مگر انسان کی بھلائی آخر تک جاری رہتی ہے ۔ میں تمام انسانوں کی رُوح ہوں جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے ۔" یہ کہہ کر وہ دُولہن غائب ہو گئی اور بڈھا اپنی جگہ آ بیٹھا ۔

اب پھر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی کا نہیں کیا تھا ۔ اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے ۔ نیک کام جو کئے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کئے تھے ۔ خاص انسانی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا ۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دلفریب دُولہن کے ملنے سے مایوس ہوا ۔ اپنا اخیر کا زمانہ دیکھ کر آئندہ کچھ کرنے کی بھی اُمید نہ

پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بے قرار ہو کر چلا اُٹھا۔ ہائے وقت! ہائے وقت! کیا پھر تجھے بلا سکتا ہوں؟ میں دس ہزار دینار دیتا، اگر وقت پھر آتا اور میں جوان ہو سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور بے ہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر گذری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اس کو گلے لگا کر اس کی بلائیں لیں۔ اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آکھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا کہ "بیٹا کیوں برس برس کے دن روتا ہے؟ کیوں تو بے قرار ہے؟ کس لئے تیری ہچکی بندھ گئی ہے۔؟ اُٹھ، منھ ہاتھ دھو۔ کپڑے پہن۔ نو روز کی خوشی منا۔ تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں۔" تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اس نے سُن کر اس کو جواب دیا کہ "بیٹا! بس تو ایسا مت کر، جیسا اس پشیمان بڈھے نے کیا بلکہ ایسا کر جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا۔"

یہ سُن کر لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا کہ "اوہ! یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے۔ میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤں گا۔ اور ضرور اس دلہن کو بیاہوں گا۔ جس نے

اپنا خوبصورت چہرہ مجھ کو دکھلایا۔ اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔ او خدا! او خدا! میری مدد کرو۔"

پس اے میرے پیارے نوجوان ہموطنوں! اور اے میرے بچو! انسانی بھلائی پر کوشش کرو۔ تاکہ اخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے۔ اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور انسانی ہمدردی اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔

رتن ناتھ نام، سرشار تخلص۔ سنہ ۱۸۴۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے
ابتداءً کھیری کے ضلع اسکول میں مدرس تھے، پھر اودھ پنچ اخبار کے
ایڈیٹر ہوئے۔

فسانۂ آزاد آپ کا مایۂ ناز کارنامہ ہے۔ اس کی زبان لکھنؤ کی
ٹکسالی زبان ہے۔ عبارت مقفیٰ اور رنگین ہے۔ مکالموں میں شوخی
اور برجستگی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بات چیت ہو رہی ہے۔
طرز ادا ایسا ہے کہ پڑھنے والا پھڑک اٹھتا ہے۔ تحریر کا مقصد
در پردہ اصلاح ہے۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں رحلت فرمائی۔

ضعیف الاعتقادی

کوچہ گردوں کے پشت پناہ، رہ نوردوں کے قبلہ گاہ، قلمرو
وحشت کے شہنشاہ ذیجاہ میاں آزاد کو ایک دن شوق چرّایا کہ کسی
مسجد میں جا کر نماز دوگانہ پڑھیں۔ سوچے کہ آج یوم الجمعہ روز آدینہ ہے
مکتبوں میں یہ آزادی کا سکّہ بیٹھاتا ہے۔ مسجدوں میں اس کے نام کا خطبہ
پڑھا جاتا ہے۔ آج کے مبارک دن سے سبزۂ گل بھی ہزار زبان سے
وحدہٗ لاشریک لہٗ گویا ہیں بلبلانِ رنگین گفتار کو وظیفہ معشوقِ حقیقی
وردِ زبان ہے۔ طاؤسِ طناز فرطِ طرب سے رقص کناں ہے طوطی
مثل حلہ پوشانِ جناں سبز پوش ہے۔ صوفیٔ صباحی نشۂ بادۂ ما عرفناک حق
معرفتک میں سرخوش و مدہوش ہے۔ جدھر دیکھو تسبیحیں کھٹا کھٹ چل
رہی ہیں، شراب ارغواں کی مٹھوریں جوش سے ابل رہی ہیں۔ یا الٰہی
کیا روز برکت آثار ہے کہ ہر در و دیوار فیض بار ہے۔ جمعہ زہ

بادیۂ ظلمت کے لیے چراغ ئمراغ ہے، جمہ عرفان کا پھولا پھلا باغ ہے

میاں آزاد ایسے مزے میں آ رہے کہ معاً چل کھڑے ہوئے دیکھتے کیا ہیں کہ بڑے بڑے زہاد اور مولانا بالعلم والفضل اولٰنا اور قاضی و مفتی و شیخ و شاب عمامۂ فضیلت برسر اور قبائے معرفت در بر باجبہ و دستار بصد فخر و افتخار چلے جاتے ہیں چہرہ سے نور الٰہی برستا ہے۔ دور فلاں ساغر نوش بصد جوش و خروش جن اور چڑیل کی باتیں ان کے قریب آئے ایک حکیم و شیمیم دوسرا لاغر۔

الحکیم — یار تم تو مغز کے بھیجے کے گودے کے کیڑے تک چاٹ گئے بڑے بکی ہو۔ لاکھوں دفعہ سمجھایا کہ یہ سب ڈھکوسلا ہے مگر نہیں تو تجھے گھڑے کی چڑھتی ہے۔ تم کب سننے والے ہو۔ مرد آدمی یہ سب لغو باتیں ہیں واللہ بنی ہوئی باتیں ہیں

لاغر — قبلہ مرد آدمی تو خواہ مخواہ آپ ہی ہیں۔ ماشاء اللہ صاحب ترو نوش، واللہ گینڈے سے ہو رہے ہو۔ یار کس چکی کا پسیا کھاتے ہو۔ مرتے آدمی تو بہت دیکھ ڈالے مگر واللہ ہے جو ایسی کلائی ایک کی ہو۔ ٹھاٹا بجنے پڑ تا ہے۔ مگر استاد یاد رکھو سے

الشیب لاغر میاں کیا لائے رہ ز میدان تہ گاؤ پروازی
جیسے تم بچھڑے ویسی تمہاری بھینس بھڑی

حکیم — بجا ہے پیر و مرشد۔ یونان کے حکماء کا مزاج بھول بھی

بڑے تن و توش کا آدمی تھا مگر اچھے اچھے حکیم ادیب اور علمائے ادیب اس کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ یہ بحث میں موٹے اور دبلے سے کیا واسطہ اگر آپ بھوت پریت دکھادیں تو ٹانگ کے نیچے سے نکل جاؤں۔

لاغر۔ ہاں یہ دعویٰ! ابھی پرسوں ہی کا تذکرہ ہے کہ میرے ایک دوست نے آدھی رات کے وقت دیوار پر ایک چڑیل دیکھی چوٹی تا ناف اور پیچھے کا صاف بال بال میں موتی پروئے ہوئے یہ سنٹ مارے پڑے رہے منکے تک نہیں مگر آپ کہہ دیں گے جھوٹ ہے۔

حکیم۔ بھائی یہ سب غبن ہے۔ یہ واہمہ وہ بلا ہے جو صورت بنادے اور سانپ ہے حس و حرکت دکھادے۔ چلا پھرا دے۔ واہمہ خلاق ہے آپ کیا جانیں۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تو پیدائش ہے آپ کی۔ اور میاں کرور باتوں کی ایک بات ہے کہ بے دیکھے اپن جانب نہ پٹنیا ئیں گے۔ لوگ بات کا بتنگڑ اسوئی کا بھالا۔ بد رو کا نالا بنادیتے ہیں۔ ایک بھیج تو ننانوے نغو۔ پتا گھر کا اور بنا۔ نہ سر کا۔ اور آپ ایسے ڈھمل یقین حضرات کا تو کہیں ٹھکانا ہی نہیں۔ جو سنا فوراً تسلیم کرلیا برہان و دلیل سے سروکار نہیں۔ رات کو درخت کی پھنگی پر بندر دیکھ اور روح فنا ہوگئی کہ پریت جھانک رہا ہے بولے اور ٹینٹوا لیا۔ کلبلائے اندر گلا دبوچا۔ ذرا ہلے اور شامت آئی۔ اندھیرے گھپ

یں تو یوں انسان کا جی گھبراتا ہے۔ اور جو بھوت پریت کا خیال جم گیا تو ساری چوکڑی بھول گئے۔ ہاتھ پاؤں سب پھول گئے۔ بلی نے میاؤں کی اور مرغ روح قفس تن سے پرواز کر گیا۔ چوہوں کی کھڑ بڑ اور بل ڈھونڈھنے لگے۔ اب جو چیز سامنے آئے گی پریت بن جائے گی۔ اس وحشت کے قربان۔ میاں بندۂ درگاہ سب پاپڑ بیل چکے ہیں۔ کئی جن ہم نے اتارے کئی چڑیلوں سے ہم نے محلے خالی کرائے جہاں دس جنوں نے کھوپڑی پر چھاپے اور پریت نے لقمہ سنبھالا۔ میاں ہم جیتے جاگتے بھوت ہیں اور پڑھے لکھے جن۔ یہ سب ڈھکوسلا ہی ڈھکوسلا ہے، کوئی ہم پر بلائے تو جانیں۔ اور یوں گپ اڑانے کو کہیے تو ہم بھی بے پر کی اڑانے لگیں۔ یاد رکھو یہ عامل وامل سب رنگے سیار ہیں۔ ع

روٹی کما کھائے کسی طور مچھندر

بندر نہ نچائیے، مرغ نہ لڑائیے، پتنگ نہ چمکائیے۔ بھوت پریت ہی جھاڑنے لگے اتنا نہیں سوچتے کہ بھوت پریت تم ذلیل پر بھلا کس کو مانو تو پھر لونا چماری اور نٹ تیتا متیا کی بھی بھینٹ لاؤ۔ اب آپ ہی انصاف کیجیے کہ لونا چماری کو کوئی بھی مانے گا۔ ارے غضب۔ ارے ستم۔

لاغر۔ خیر اس تو تو میں میں سے کیا واسطہ۔ چلیے ہمارے ساتھ یہاں سے کوئی دو تین کوس کے فاصلہ پر گاؤں ہے وہاں ایک صاحب رہتے ہیں اگر آپ کی کھوپڑی پر ان کے عمل سے بھوت نہ چڑھ بیٹھے تو گدھے کے

پیشاب سے مونچھ منڈوالوں۔ کہئے گا شریف نہیں چارہے۔ پس اب
چلئے۔ دعوائے بے دلیل نہمل ہوتا ہے۔ بندہ بھی ثبوت دے گا۔ آپ نے
تو جہاں ند اسی چڑھائی اور بس کہنا شروع کیا کہ سب پوچ، سب ہیچ،
پیر دپیمبر، دیبی دیوتا، بھوت پریت، حور قصور، شیطان، خبیث،
بہشت دوزخ تک کے آپ قائل نہیں۔ لیکن آج ٹھیک بنائے
جائیے گا۔ یہ کہہ کر وہ دونوں اس گانوں کی طرف چلے۔ میاں آزاد
تو دنیا بھر کے بے فکر تھے ہی۔ شوق چرایا کہ چلو سیر دیکھ آؤ۔ اچھی دل لگی
ہوگی۔ یہ بھی ان خیالات دقیانوسی کے جانی دشمن تھے۔ اب کہاں
تو مسجد جاتے تھے کہ نماز دوگانہ پڑھیں کہاں چھوڑ چھکے دیکھنے کا شوق ہوا
مسجد کو دور ہی سے سلام کیا اور سیدھے سرائے چلے۔ ارے کوئی اکہ کرایہ کو ہوگا۔
کوئی اکے والا ہے۔ ارے میاں کوئی بھٹیارا اکہ کرائے کرے گا۔
جی ہاں کہاں کو جائے گا۔ کہاں کو۔ سکٹ جملاری پور۔ کیا دیجئے گا۔
پہلے گھوڑا اکہ تو دیکھیں۔ گھر گھوڑا نخاس مول۔ وہ کیا کمانی دار اکہ
کھڑا ہے اور یہ سرنگ گھوڑی ہے۔ ارے اتنی تو یہ مریل۔ ڈبلی،
پتلی۔ ہڈی ہڈی گن لو۔ یہ تو کوئی نو دن میں اڈھائی کوس چلے گی۔
کون؟ یہ گھوڑی۔ واہ حضور، ہوا سے باتیں کرتی جاتی ہے۔ بیٹھے
اور دن سے پہنچے واہ وا۔ گھوڑیا کیا ریل کا انجن ہے کہ چلتے ہی
الوپ انجن ہو جاتی ہے۔ اچھا کسو۔ چار آنے دیں گے ڈھیلی کے

پیسے لیں گے۔ میاں آزاد دوسری طرف چلے۔ پھر بولے اچھا پانچ آنے۔
نہیں کھدا وند۔ سات گنڈے سے کوڑی کم نہ لیں گے۔ اچھا سو۔
اتنے میں میاں آزاد نے ایک صاحب سے پوچھا کیوں حضرت اس
گانوں کو سک جملدی پور کیوں کہتے ہیں۔ بندہ نواز اس کی بڑی داستان
ہے۔ ایک صاحب تھے شیخ جمال الدین انہوں نے یہ گانوں بسایا۔
اور شوق چرایا کہ اپنا پورا نام رکھ دیں۔ شیخ جمال الدین پورا نام رکھا۔
گنوار آدمی شیخ جمال الدین کیا جانیں۔ انہوں نے شیخ کا سک اور جمال
کا جملی اور الدین کا دین کر دیا۔ اتنے میں اکے والے نے آواز دی کہ
یکہ تیار ہے میاں آزاد جلدی سے اکے پر سوار ہوئے اور اکا کھڑ
کھڑاتا چلا۔ اثنائے راہ میں انہوں نے پوچھا کہ کیوں بھئی دن بھر
میں کیا مل رہتا ہوگا۔ اجی اب رجگار کہاں۔ صبح سے شام تک جو
ملا چر ندم پرندم۔ دو ڈھائی آنہ جوڑ رکھا گیا۔ اور تین گنڈے گھر کے
خرچ میں آگئے۔ دھیلے پیسے کا سلیھا بنا خود اڑایا۔ پھر موچی کے موچی۔
مہاجن کے پچیس روپیہ چھ مہینے سے بیباک نہ ہوئے۔ اور جو کہیں
کبھی میں چار پانچ کوس لے گئے تو بچھیاں دھنس گئیں۔ ہاں دھرے
دارے انجر پنجر سب نکل گئے۔ دو چار کے ماتھے گئی۔ اد میاں رجگار کو
تو تمہاری سلامتی سے تب ہو جب ریل اُڑ جائے۔ اس نے سب رجگار
لے ڈالے۔ آپ آپ ہی سات گنڈے جملدی پور تک کے دیئے

مُل تین چل کر لگا کر۔ یہ نور جگار رہ گیا ہے ئے مل مل کے بلبہ نکلتا ہے۔
کوئی دو پونے دو گھنٹے میں میاں آزاد سک جلدی پور پہنچے۔
پتا و تا تو ان کو معلوم ہی تھا سیدھے چلے اور عامل کے مکان پر کھٹ
سے داخل۔ اللہ اللہ بڑی بھیڑ ہے۔ خلقت ہے کہ اُمڈی چلی آتی ہے۔
عورت مرد ٹوٹے پڑتے ہیں۔ تماشائیوں کا تانتا لگا ہے۔ ایک آدمی سے
انہوں نے پوچھا کہ کیا آج یہاں میلا ہے۔ نا ہیں میلا ویلا نا ہیں ایک
نئی کے موزیر آج پریت آئے ہے تو ل مہرار وہیں وسب دیکھے آوت
ہیں بال ہے دل لگی۔ اس جھنڈ میں انہوں نے اس کرِیم تیم آدمی کو
ڈھونڈھ نکالا جو دعوی کر کے آئے تھے کہ بھلا ہم پہ تو کوئی پریت
بلا دے اور تنہا ایک گوشے میں لے جا کر یوں کہا۔

آزاد۔۔ یہاں ہم اُن دنوں مسجد کے پاس تمہاری چہ میگوئیاں
کان دھر کے سُن رہے تھے۔ یہ سب کیا ہے آج تک ہم بھی بھوت پریت
کے قائل ہوئے ہوں۔ ہاں اب کچھ ایسی تدبیر کرنی چاہئے کہ اس عامل
کی قلعی کھل جائے۔

مجیم۔۔ اور میں آپ کس فکر میں ہوں آپ خاموش رہیں دیکھئے میں
اچھی اچھی کھٹ پٹ بناتا ہوں۔ ساری مسخنت کرکری ہو جائے تو سہی
آج ہی تو پھنسے ہیں چڑا نگجرو۔ ایسا دیا دُکہ چھٹی کا دودھ نکل پڑے
اب ہم ایک سے دو ہو گئے۔

اتنے میں عامل صاحب عباسی تہ بند باندھے لمبے لمبے بال بڑھائے
حنا کا تیل پڑا ہوا، پٹیاں جمی ہوئیں، مانگ نکالے کھڑاؤں پہنے تشریف
لائے۔ آنکھوں سے جلال برستا تھا جس کی طرف نظر بھر کر دیکھا وہی
کانپ اٹھا۔ کسی نے قدم لئے کسی نے سر پر ٹیک کی اور انہوں نے
غل مچانا شروع کیا کہ دھونی میری جلتی ہے۔ جلتی ہے اور ملتی ہے۔
دھونی میری جلتی ہے۔ کھڑی مونچھیں اور چڑھی داڑھی لمبے گیسو والا
ہے۔ لمبی زلفوں والا ہے۔ میرا ذرہ نکلے ہے جھوم جھوم کر جو انہوں
نے ہانک لگائی تو حوالی موالی سب سناٹے میں ہو گئے۔ ایک دفعہ
ہی بآواز بلند پکارا کہ کسی کو دعوی ہو تو آ کر کشتی لڑے، ہاتھی کو ٹکر دوں
تو چنگھاڑ کر نوک دم بھاگے (خم ٹھونک کر) ہے کون آتا ہے۔ اب سنئے
کہ پہلے سے ایک شخص کو سکھا پڑھا تھا وہ تو سدھا ہوا تھا ہی جھٹ
کھڑا ہو گیا۔ ہم لڑیں گے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک ڈنڈ پیل کشتی گیر
مقابلے کے لئے کھڑا ہوا ہے۔ تین انچ کی دبیز گردن۔ گینڈا بنا ہوا۔ خدا
ہی خیر کرے۔ مگر عامل کی وہ ہوا بندھی تھی کہ لوگ اس پہلوان کی حالت
پر افسوس کرتے تھے کہ بیدھا ہے۔ عامل چٹکیوں میں زور سحر سے چرمر
کروا لے گا۔ الغرض دونوں آمنے سامنے آئے اور عامل نے گردن پکڑتے
ہی زمین پر دے پٹکا۔ وہ مارا کہ دو گز دھنس گیا اور پہلوان پندرہ
منٹ تک بیہوش بنا رہا۔ میاں آزاد نے حکیم سے کہا کہ یہ ملی بھگت

بے اسی طرح گنوار معتقد ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جی ہیں ایسے مزدوروں کی قبر تک سے واقف ہوں۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ میاں عامل نے پھر اکڑتے ہوئے ہانک لگائی کوئی آدمی آزمائے گا۔ میاں آزاد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ چٹ لنگوٹ باندھ دھم سے کود پڑے آؤ اُستاد ایک ایک پکڑ ہم سے بھی ہو جائے تب تو عامل صاحب چکرائے کہ یہ اچھے بگڑے دل ملے۔ پوچھا آپ انگریزی خواں ہیں؟ آزاد نے کڑک کر کہا حضرت میں فقیخواں ہوں۔ بس اب سنبھلئے میں آگیا۔ یہ کہہ کر گھٹنا ٹیک کر قلا جنگ کے پیچ پر مارا چاروں خانے چت۔ عامل زمین پر دھم سے گرے۔ ان کا گرنا تھا کہ میاں آزاد چھاتی پر چڑھ بیٹھے۔ اب بتا دیکھ کاٹ لوں ناک۔ کتر لوں کان۔ باندھوں دم میں نمدا۔ بات نیرے کی عامل بنے ہیں۔ لچھم نے جھپٹ کر آزاد کو گود میں اُٹھا لیا واہ اُستاد کیوں نہ ہو۔ میاں عامل کی ساری شیخی خاک میں مل گئی۔ گنواروں کا عقیدہ جاتا رہا۔ بچارے کو اسی دن گانوں چھوڑنا پڑا۔ صحرائے دشت نوردی میں گے گرد باد، دی جودت وقاد میاں آزاد اس رنگ میں آ کے عامل کو نیچی بتا کر اور گانوں کے ڈھلمل یقین گنواروں کو سیدھے ڈھرے پہ لگا کر میاں لچھم فہیم کو ساتھ لے ہاتھ میں ہاتھ دے شہر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ راستہ میں اسی عامل کی باتیں مزے مزے کی چہ میگوئیاں کھلی بازبان ٹھٹھے ہوتے جاتے ہیں۔

کیوں میں کہتا کیسا اڑنگا دیا بہت بلبلا رہے تھے چڑا سے
سمجھے تھے اب ہمارا کوئی سرکوب ہی نہیں۔ فرعون کے لیے کوئی موسیٰ نہ آئے گا
یہاں استادوں کی آنکھیں دیکھی ہیں پور پور میں کچھی کوٹ کوٹ کر بھری
ہے۔ ایک ایک پینچ کے دو دو سو توڑ یاد ہیں۔ گھنٹوں لڑوں ہانپنے
کا نام نہ لوں۔ ممکن کیا کہ دم ٹوٹے۔ لڑ بیٹے کا تو گینڈا ہی اس کا
ٹھٹھا۔ گردن موٹی نہیں چھاتا چوڑا نہیں۔ بدن کٹ پٹی نہیں۔ کان
ٹوٹے نہیں۔ چتونوں سے تاڑ گیا کر گھامڑ ہے۔ گردن پکڑتے ہی چرمرا
کر ڈالا۔ ہاما چاروں شانے دھڑ سے زمین پر گرا اساللہ ادعوں۔
بہت بلوں پہ سمجھے بچے جی۔ حالی کی دم ہے تھے یاد ہی تو کرتا ہوگا۔
قسم خدا کی جھانسے باتوں کی ذرا بھی اصلیت ہو۔ کیسا دیت کس کا
بھوت کہاں کی چڑیل۔ سب ڈھکوسلے سب گپ مگر غفلت بھی
کیا بکھیڑا ذ عسان ہے سن لیا چاہیں بس فوراً ایمان لائیں۔ مادر سنئے
ایک مرتبہ ایک بڈھے پھنے بیدھ ملتا ما کر بیٹھے اور لگے ہنکارنے
کہ کوئی چھپا کر ہاتھ میں پھول لے ہم جھٹکیوں میں بتا دیں گے آگ
لگ گئی واللہ شعلے بدن سے نکلنے لگے۔ میں نے کہا اچھا ہم نے
پھول لیا آپ بتلائیے کیا ہے۔ پہلے تو آنکھیں نیلی پیلی کر کے مجھے ڈرانے
لگے میں نے کہا میاں عقل کے ناخن لو میں ان گیدڑ بھبکیوں میں نہ آنے
کا۔ یہ پتلیوں کا تماشا کسی نادان کو دکھاؤ۔ لے بتاؤ۔ بس بتاؤ تھوڑی دیر

سوچکر بولے زرد پھول ہے۔ میں نے کہا کہیں ہو نہ زرد۔ اتنا کہنا تھا کہ کہاں پھول کا رنگ زرد بتاتے تھے کہاں حضرت کا چہرہ زرد ہو گیا۔ رنگ فق

ع کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

پھر گھبرا کر فرمایا کہ ارے دھوکا ہوا۔ سبز پھول ہے۔ میں نے کہا واہ بھئی لال بھبھوکا کیوں نہ ہو۔ بھینس نہ کودی کودے گون یہ تماشا دیکھے کون۔ ہرا بھرا پھول آج تک دیکھا نہ سُنا۔ این گل دیگر شگفت۔ اچھا شگوفہ چھوڑا۔ واللہ یہ نیا گل کھلا۔ واہ بھئی۔ میرا اس قدر کہنا کہ ان کا گلاب سا چہرہ کمھلا گیا۔ میری باتیں کانٹے کی طرح چبھنے لگیں اور ادھر ع

لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا

واللہ کوئی اُس وقت ان کی بیکلی دیکھتا اور میں جامے میں پھولا نہ سماتا تھا۔ غنچے کی طرح کھلا جاتا تھا۔ ان باتوں سے اُنہیں ایسا غار ہوا کہ بگولا بن کے وہاں سے پتا توڑ بھاگے۔ حکیم نے کہا۔ اُستاد واللہ باللہ ایک تم کو اپنا ہمعصر ملاحظہ پایا۔ یار ہم بھی یہ سب معرکے جھیلے ہوئے ہیں۔ سب کھیل کھیلے ہوئے ہیں۔

سُنئے ایک دفعہ ایک صحبت میں جانے کا اتفاق ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نیم ملا خطرۂ ایمان لسان الغیب بنے بیٹھے ہیں اور اچھے اچھے تربیت یافتہ ان کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ پوچھا آپ کی تعریف کیجئے ایک صاحب نے جو اس مزور کا ایمان لا چکے تھے۔ دبے دانتوں کہا شاد صاحب

عجب داں ہیں آپ کے کمالات ظاہری و باطنی کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ دس بانچ نے تو اُن کو آسمان پر بھی چڑھا دیا۔ میں نے کہا نوز نہ جو اسے جھنڈے ہی پر نہ چڑھاؤں کیوں شاہ جی صاحب قبلہ یہ تو بتایئے ہمارے گھر میں لڑکا کب تک ہوگا۔ شاہ جی سمجھے کہ یہ بھی نرے چونگا ہی ہیں۔ چلو اناپ شناپ بتا کر چونگا کرو اور کچھ لے مرو۔ میرا اور میرے باپ دادا اور ان کے باپ دادا کا نام پوچھا یہاں حافظ کی یہ کیفیت ہے کہ باپ کا نام تو اکثر یاد بھی رہتا ہے دادا جان کا نام کس ملعون کو یاد ہوگا خیر جو زبان پر آیا الول جلول بتایا تو حضرت فرمانے کیا ہیں بچہ دو مہینے کے اندر ہی اندر بنیا لے ہامیں! شاہ صاحب قبلہ ذری سنبھلے ہوئے۔ اب تو کہا اب نہ جیئے گا۔ دیکھئے میں جتائے دیتا ہوں کیا خوب آپ اچھے تلے اچی حضرت کچھ خبر ہے۔ پندرہ دن تو بندے کی شادی کو ہوئے اور آپ فرماتے ہیں دو مہینے کے اندر ہی اندر لڑکا لے۔ واللہ دوسرا کہتا تو خون پی لیتا۔ اس فقرے پر۔ یار لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ کمرہ گونج اُٹھا اور شاہ جی کے آئے حواس غائب ہو گئے۔ دل میں تو کروڑوں صلوائیں سنائی ہوں گی۔ اے حضرت کیا عرض کروں اس جوار میں لوگ انہیں معاذ اللہ خدا سمجھتے تھے۔ شاہ جی کبھی روپیہ برساتے تھے کبھی بے فصل کا میوہ منگواتے تھے۔ کبھی گھڑے کو چکنا کر کے پھر ثابت کر دکھاتے تھے۔ غرض سینکڑوں ہی الٹیں سیدھیں یاد تھیں مگر میاں میرے سامنے تو ایک نہ چلی۔ نام سُنا تو ہکا بکا ہو گئے۔ صورت

دیکھی اور نخرے اٹھے جیسے شاہ چور سے اور سانپ مور سے ڈرے۔ میاں آزاد نے مسکرا کر
کہا واللہ شاہ اور چور کی اچھی تشبیہ دی۔ بھئی سنو آزاد ہم گنوار آدمی تین پانچ تو جانتے
نہیں ہمیں بات کرنا کیا آئے۔ یا ہم تو دوست کے دوست ہیں مگر ایسے قابو چیوں
کے البتہ دشمن ہیں۔ جہاں میں ہوں بھلا کسی صدہ یا شاہ جی یا عامل کا رنگ تو
جم جائے۔ کیا مجال۔ رگید رگید کر اور کھدیڑ کھدیڑ کر ماروں ادھر اگر نیوں
تو وجہ کہا میں تو زمانہ بھر کا نیارا یا چھٹا ہوا شہدا۔ ایک ہی کائیاں ہوں۔
مجھ سے اکڑ کے جائیں گے کہاں نیچے پاتال تک کی تو خبر میں لاؤں اور
آسمان میں تھگلی لگاؤں۔ مجھ پر بھلا وہ بیچارے کیا ہاتھ صاف کریں گے

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک صاحب نے پوچھا کہ کیوں پیرو
مرشد آپ انگریزی پڑھے ہیں۔ میاں آزاد نے کہا جی ہاں کچھ شد بد
جانتے ہیں۔ آپ اپنا مطلب کہیں۔ یا حضرت ایک دو پٹی عرضی کا
ترجمہ منظور ہے۔ میری ہفتاد پشت پر احسان کیجئے۔ اس کو فصیح
انگریزی میں خوب نمک مرچ لگا کر لکھ دیجئے۔ نمک مرچ! نمک
مرچ لگانا میں کیا جانوں۔ یہ کسی گول گپے والے سے کہئے۔ بندے
نے کالج میں یہ علم پڑھایا نہیں۔

ذکاء اللہ خاں

ذکاء اللہ نام ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ پہلے دلی کالج میں
ریاضی کے معلم پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے اور آخر میں
میور کالج الہ آباد میں دس برس تک پروفیسر رہے۔

آپ نے ریاضیات، تاریخ و جغرافیہ، علم ادب اور علم اخلاق
پر متعدد کتابیں لکھیں۔

طرز نگارش سلیس، رواں اور بے تکلف ہے۔ مشکل
سے مشکل بات کو مختصر عبارت میں سلجھا دیتے ہیں۔ اگرچہ طرز تحریر
کسی قدر روکھا پھیکا ہے لیکن جن موضوعوں پر آپ نے طبع آزمائی
کی ہے، ان میں شگفتگی اور دلکشی کا زیادہ امکان بھی نہیں۔
۱۹۱۰ء میں فوت ہوئے۔

٦

کتب کا مطالعہ

مطالعہ تنہائی و عزلت میں خوشی بخشتا ہے گفتگو و تقریر میں حسن بیان کرتا ہے۔ معاملات کے فیصلہ کرنے اور مقدمات میں رائے دینے کی قابلیت بڑھتی ہے۔ گو معاملات اور مقدمات کا تیز و چالاک آدمی بھی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ مگر مقدمات اور منصوبوں کی ترتیب اور عالم اصلاح کی تدابیر جیسی کہ چاہیئے اچھے عالم و فاضل ہی کرتے ہیں۔

تم اس واسطے نہ پڑھو کہ لوگوں کے خلاف باتیں کہیں گے اور ان کی باتوں کی تردید کریں گے۔ یا سب باتوں کو یقین اور تسلیم کریں گے یا ہم خود بہت سی باتیں بنائیں گے۔ بلکہ پڑھنے سے مقصد اعظم یہ ہو کہ ہم لوگوں کی باتوں کو تولیں گے اور سوچیں گے پھر جو عمل کرنے کے قابل ہوں گی ان پر عمل کریں گے۔ بعض کتابوں کا صرف مزہ

پڑھا جاتا ہے بعض بالکل نگلی جاتی ہیں یعنی کل پڑھی جاتی ہیں مگر بے تو جہی اور بے غوری سے بہت تھوڑی کتابیں ہیں جو چبا چبا کر ہضم کی جاتی ہیں۔ کتابوں کے انتخابات سے جو کتابیں بنتی ہیں، اُن کا حال آب مقطر کا سا ہے۔ آدمی پڑھنے سے کامل بنتا ہے۔ اس سے تقریر شستہ اور تحریر چست و درست ہو جاتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ آدمی کو دانشمند و تجربہ کار بنا دیتا ہے۔ نظم کا مطالعہ طبیعت میں جودت پیدا کرتا ہے۔ علوم ریاضیہ کا طبیعت کو ذکی بناتا ہے اور علوم طبیعہ کا ذہانت کو عمیق، علم اخلاق کا سنجیدہ و متین منطق۔ علم بلاغت و فصاحت کا مباحثہ و مناظرہ کی قابلیت پیدا کرتا ہے غرض مطالعے کا اثر فرد انسان کے اوضاع و اطوار و کردار پر ہوتا ہے۔

انسان کے امراض جسمانی کے جیسے خاص علاج ہیں۔ ایسے ہی امراض ذہنی کے بھی مخصوص علاج ہیں۔ سینہ و شش کا علاج شکار معدے کا علاج ہے ہیج قدم قدم چلنا۔ دماغ کا علاج گھوڑے پر سوار ہونا۔ علیٰ ہذا القیاس اور علاج ہیں۔ اسی طرح اگر ذہن میں آوارگی اور پریشانی ہو۔ تو علوم ریاضیہ کا مطالعہ اس کا علاج ہے جو اس کے ذہن کی پریشانی کھو دے گا۔ اگر ذہن بے تمیز ہے کہ وہ دو چیزوں میں تمیز اور فرق نہیں کر سکتا تو حکمت و فلسفہ اس کا علاج ہے اگر ذہن ایسا ہے کہ وہ ایک بات کے ثبوت سے دوسری بات

کی توضیح نہیں کر سکتا۔ تو قانون دانوں کے فیصلہ جات کا پڑھنا اس کی دوا ہے۔ غرض امراض ذہنی کے ایسے ہی علاج ہوتے ہیں۔

مطالعہ کتب میں تو عاقلوں سے باتیں ہوتی ہیں اور کاروبار زندگی کے معاملات میں بیوقوفوں سے جو مطالعہ کتب ہمارے کاروبار زندگی میں کام نہیں آتا اس کو بھی بیکار نہ جانو۔ کیونکہ وہ ہماری عقل و فہم کو درست کرتا ہے۔ مطالعہ ہی ایک ایسا فن ہے جو اور فنون کے استعمال کو سکھاتا ہے۔

دانشمندوں کے کلام کے مطالعے پر نوجوان اپنے دماغ کو متوجہ کرے گا تو ابتدا میں مسرت حاصل ہوگی۔ پھر دانائی کے ساتھ مواصلت کسی مطالعہ سے مضرت کبھی نہیں ہوتی بلکہ ہر مطالعے کے ساتھ مسرت ہے جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ علم کے پیچھے پڑنے سے صحت کو مضرت پہنچتی ہے وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطالعہ کرنے والوں کی عمریں بھی ایسی ہوتی ہیں جیسے اور پیشے والوں کی اس مشاہدے کی صداقت کی شہادت تاریخ بھی دیتی ہے۔ طالب علموں کی باقاعدہ اور آرام کی زلیست صحت و تندرستی کو زیادہ کرتی ہے اور بہت سی تکالیف اور امراض سے بچاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ شرط ضرور ہے کہ وہ اپنی فضول حرارت جسمانی کو معتدل ورزش جسمانی سے کم کرتا رہے اور جسم

کو کاہلی کا عادی نہ بنائے۔

آدمی اپنا وقت کاٹنے کے لئے حقہ پیتے ہیں۔ بلاس سونگھتے ہیں اور اسی سے مسرور ہوتے ہیں۔ اب اس سے سمجھ لینا چاہیئے کہ جو لوگ کسی فن یا علم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں ان کا وقت کیسا خوشی سے کٹتا ہوگا، ابتدا میں جو اس کے اندر کچھ محنت معلوم ہوتی ہے وہ آگے جا کر تفریح طبیعت ہو جاتی ہے۔

جب آسمان پر چاند کی چاندنی کا لمپ روشن ہو تو یہ وقت تیرے مطالعہ کے لئے اچھا ہے کہ تیری کتاب کے صفحوں پر چاندنی پڑے تو اس میں باریک اور نازک معانی کو دیکھے اور چاند اور ستاروں کی سحر کاری کو سمجھے نفس کے واسطے مطالعہ ایسا ہے جیسے جسم کے واسطے ورزش۔ ورزش جسمانی سے جسمانی تنومندی اور تندرستی حاصل ہوتی ہے مطالعے سے نیکی جو روحانی صحت ہے ہاتھ آتی ہے۔ ورزش سے جو خاص جسم کی تنادری کے لئے کی جارے کچھ تکان ہوتی ہے۔

اسی طرح مطالعے سے بھی جو نفظ نکوکاری کے واسطے کیا جائے کچھ تکلیف ہوتی ہے مگر جب کہیں پسندیدہ کام سے مسرت پیدا ہوتی ہے تو اس کی تکلیف اور تکان کی پرواہ نہیں ہوتی۔ شکار کھیلنے سے مسرت و صحت ایسی حاصل ہوتی ہے کہ اس کی محنت راحت

معلوم ہوا کرتی ہے۔ ایسے تمثیلات اور نقل و حکایات کے نصائح کے مطالعہ سے انبساط و صحت روحانی حاصل ہوتی ہے اور اس کی محنت کچھ نہیں معلوم ہوتی۔

بعض مطالعہ کرنے والے ایسے نادان ہوتے ہیں کہ متقدمین کی وہ کتابیں مطالعے میں رکھتے ہیں۔ جن کا بہت سا حصہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا لیکن جہاں کہیں کوئی مضمون ان کی سمجھ میں آجاتا ہے تو خوشی کے مارے اچھل پڑتے ہیں اور کپڑوں میں پھولے نہیں سماتے لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ دس باتوں میں سے ایک سمجھ میں آئی تو کیا آئی۔
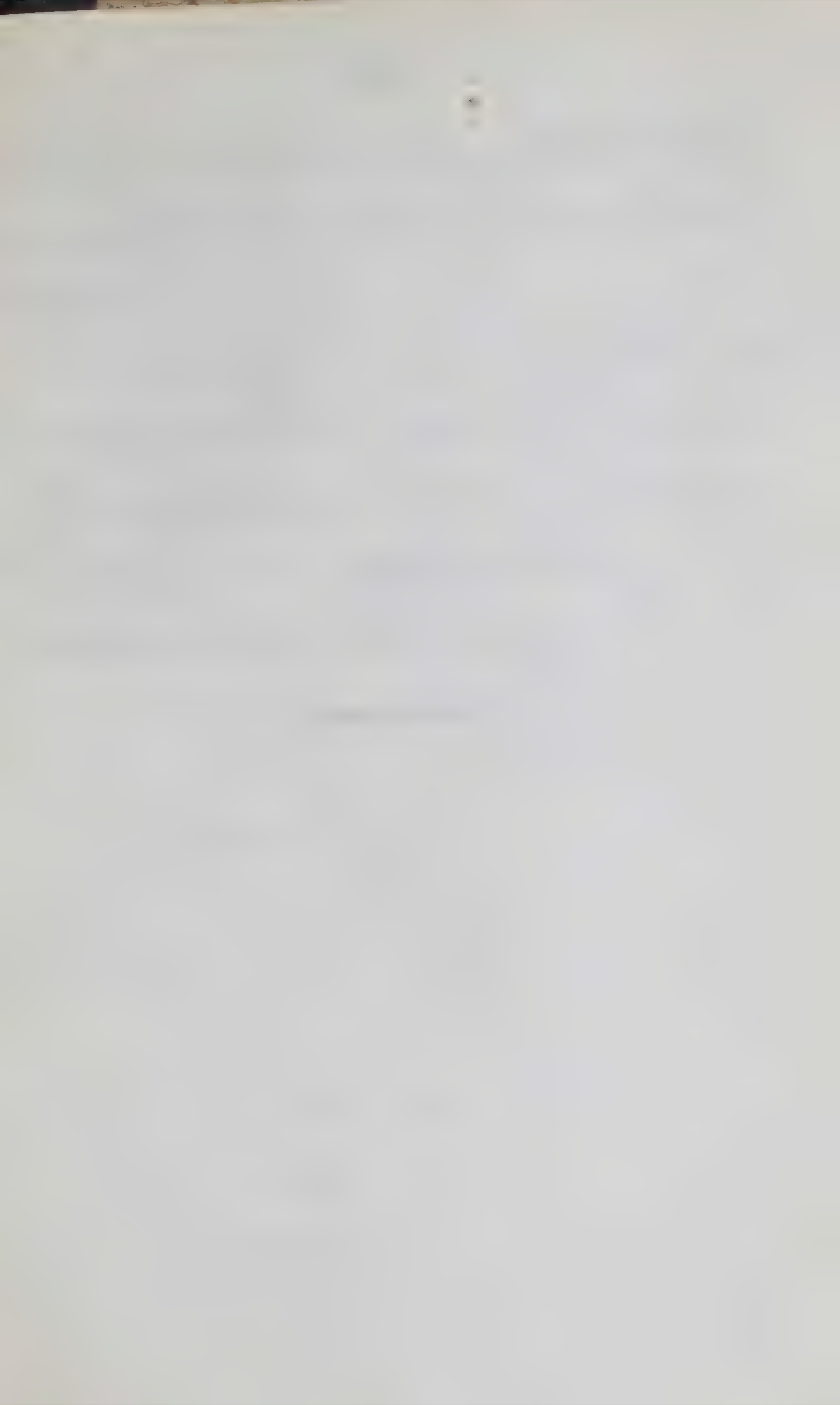
محمد حسین آزاد

محمد حسین نام، آزاد تخلص سنہ ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد لاہور میں ملازم ہوئے۔ پھر "اتالیق پنجاب" کے سب ایڈیٹر رہے۔ آخر میں گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر ہوئے۔

عبارت میں حسن، سادگی اور شگفتگی ہے۔ بے مثل انشا پرداز تھے۔ تحریر میں بلا کی شوخی، رنگینی اور پرکاری ہے۔ آپ نے اردو ادب میں ایک ایسا طرز اختیار کیا جو کسی اور سے ممکن نہ ہو سکا۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں رحلت فرمائی۔

۷

بچپن

سنہ ۹۶۴ھ میں بیرم خاں کا بڑھاپا اقبال کی جوانی میں لہلہا رہا
تھا۔ ہیموں کی مہم مار لی تھی۔ اکبر شکار کھیلتے لاہور کو چلے آتے تھے، جو
نغمہ بلبل کی سرزمیں ہے۔ کسی نے آواز دی کہ بڑھاپے کے باغ میں رنگین پھول
مبارک ہو۔ فتح کی خوشی میں یہ خوش خبری نیک شگون معلوم ہوئی۔
اس لئے بادشاہ نے جشن کیا۔ وزیر نے خزانے لٹائے اور اپنے
بیگانے کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ بیرم خاں کو تو عالم جانتا
ہے۔ ماں کا خاندان بھی معلوم کر لو کہ جمال خاں میواتی کی بیٹی، حسن خاں
میواتی کی بھتیجی تھی۔ بڑی بہن بادشاہ کے محل میں تھی۔ چھوٹی وزیر کے
حرم سرا میں۔ خالو بادشاہ نے خود عبد الرحیم نام رکھا۔ مبارک
مولود کی ولادت خاص اُسی شہر لاہور میں ہوئی
یہ پھول قریب تین برس کے ناز و نعمت کی ہوا میں اقبال

کے شبنم سے شاداب تھا۔ دفعۂ خزاں کی نحوست ایسی بگولا بن کر پہنچی کہ اس کے گلشن کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا اور گھاس پھوس کی طرح مدت تک بہ زباں رواں کرتی رہی۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ اس کا ٹھکانا بھی کہیں لگے گا یا نہیں۔ ہم کاغذوں کو دیکھنے والے ترس کھاتے ہیں۔ وائے برحال اس کے رشتہ داروں اور ہوا خواہ نمک خواروں کے، جب اس کی اور اپنی حالت کو یاد کرتے ہوں گے تو چھاتی پر سانپ لوٹ جاتے ہوں گے کہ کیا تھا اور کیا ہوگا۔ مگر حق یہ ہے کہ ایسے ہی اونچے سے گرتے ہیں۔ جب اس قدر اونچے پہنچے ہیں کہ دیکھنے والے تعجب کر کے کہتے ہیں "یہ تارا کہاں سے نکل آیا؟"

خزانہ نوالدولہ، یا سوکھا کر دا، باپ کا ہاتھ بچوں کے رزق کا چمچہ، بلکہ ان کی قسمت کا پیمانہ ہوتا ہے۔ جب بیرم خاں کے اقبال نے منہ پھیرا اور اکبر رقیبوں کی باتوں میں آ کر دلی میں آن بیٹھا، بیرم خاں آگرہ میں رہ گئے یہیں سے نحوست کا آغاز سمجھنا چاہیے۔ حال یہ تھا کہ رفیق ساتھ چھوڑ چھوڑ کر دلی چلے جاتے ہیں۔ عرضیاں جاتی ہیں تو الٹے جواب آتے ہیں۔ عرض معروض کے لیے وکیل پہنچتے ہیں تو دربار کے طور بے طور۔ خبر آتی ہے وحشت ناک۔ بچہ معصوم ان رازوں کو نہ سمجھتا ہوگا مگر اتنا ضرور دیکھتا ہوگا کہ باپ کی مجلس میں رونق نہیں۔ وہ امرا اور درباریوں

کی بھیڑ بھاڑ کیا ہو گئی؟ باپ کس فکر میں ہے کہ میری طرف دیکھتا نہیں؟
بیرم خاں بیچارہ کیا کرے کبھی بنگالہ کا ارادہ کرتا ہے کبھی
گجرات کا کہ کھمبھ کو چلا جائے۔ اِدھر رستہ نہیں پاتا۔ راجپوتانہ کا
رُخ کرتا ہے۔ چند روز اِدھر اُدھر پھرتا ہے آخر پنجاب کو آتا ہے۔
کچّا ساتھ، اپنے حال کو سنبھالے کہ عیال و اطفال کو۔ آخر حرم سرا اور
جواہر خانہ، توشہ خانہ وغیرہ بہت سے لوازمات و اسباب کو بھٹنڈے
میں چھوڑا اور پنجاب میں آیا۔ بھٹنڈے کا حاکم، اپنا نمک پروردہ،
خاک اُٹھایا ہوا تھا، ہاتھوں کا پالا ہوا، چھوٹے سے بڑا کر کے حکومت
تک پہنچایا ہوا، اس نے مال و عیال کو ضبط کر کے روانہ دربار کر دیا۔
دلّی میں آ کر سب قید، اسباب خزانہ میں داخل، تین چار برس کا بچہ،
روز کی پریشانی، اور بے سر و سامانی، اور گھر والوں کی سرگردانی، روز
نئے شہر نئے جنگل دیکھ کر حیران ہوتا ہو گا کہ یہ کیا عالم ہے اور ہم کہاں ہیں؟
میری ہوا خوریوں کی سواریوں اور سب کی دلداریوں میں کیا فرق آ گیا
ہے۔ جو لوگ ہاتھوں کی جگہ آنکھوں پر لیتے تھے وہ کیا ہو گئے؟

اس حالت کی تصویر سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ دربار سے
رخصت ہو کر حج کو چلا گیا۔ گجرات پٹن پر ڈیرے ہیں، ابھی سورج جھلکتا
ہے۔ شام قریب ہے۔ خیال یہ کہ اب خانخاناں آتا ہے، خبر آئی کہ وہ
تو مارا گیا۔ اس کے مرتے ہی فوج میں تلاطم مچ گیا، پل کے پل میں گھربار

افغانوں نے لوٹ لیا۔ کوئی گٹھڑی لئے جاتا ہے، کوئی صندوقچہ، کسی نے بستر گھسیٹ لی، کوئی بچھونا لے چلا، اس بے کس مردے کے کپڑے تک اتار لئے۔ اس بے جان کو کفن کون دے؟ کہ اپنی جان ہی کا ہوش نہیں۔ وہ تین برس کی جان کیا کرتا ہوگا؟ سہم کر رہ جاتا ہوگا۔ ماں کی گود میں دبک جاتا ہوگا۔ ڈرتا ہوگا۔ انا کے پاس چھپ جاتا ہوگا۔ افسوس وہ بیچاریاں کہاں چھپالیں؟ آپ ہی چھپنے کی جگہ نہیں۔ الہی تیری پناہ! عجب وقت ہوگا۔ شام غریباں اس شام کو کہتے ہیں۔ رات قیامت کی رات گزری، دن ہوا تو روز محشر، محمد ابن دیوانہ اور زنبور وغیرہ لشکروں کے لڑانے والے تھے۔ اس وقت کچھ بن نہ آئی تھی۔ پھر بھی ہزار رحمت کہ لٹے قافلہ کو سمیٹا ہے اور احمد آباد کو لوٹے جاتے ہیں، موقع پاتے ہیں، تو پلٹ کر ایک ہاتھ مار جاتے ہیں۔

اس وقت پاشکستہ عورتوں کو، جن میں سلیمہ سلطان بیگم اور یہ تین برس کا بچہ بھی شامل ہے، لے نکلنا غنیمت ہے۔ لٹیرے اب بھی سست بردار نہیں ہوئے۔ پیچھے لپٹے تاپنے چلے آتے ہیں۔ معصوم بچہ سہما ہوا ادھر اُدھر دیکھتا ہے اور رہ جاتا ہے۔ کون دلاسا دے؟ ... رے تو ہوا کیا ہے؟ الہی وہ وقت تو دشمن ہی کو نصیب نہ ہو۔

ان مصیبت زدوں نے لڑتے مرتے احمد آباد میں جاکر دم لیا۔

کئی دنوں میں گئے ہوئے حواس ٹھکانے آئے۔ صلاح ہوئی کہ دربار کے سوا پناہ نہیں ہے۔ پھر چلنا چاہیئے۔ چنانچہ چار مہینے کے بعد ضروری سامان بہم پہنچا کر روانہ ہوئے۔ یہاں بھی خبر پہنچ گئی تھی۔ چغتائی دربار دلی اور اکبری عفو و کرم کے دریا میں لہرائی۔ ان کے لئے فرمان بھیجا۔ خانخاناں کے مرنے کا رنج و الم اور ان کی تباہی کا افسوس تھا۔ ساتھ ہی بڑے دلاسے اور دلداری کے ساتھ لکھا تھا کہ عبدالرحیم کو تسلی دو اور بڑی خبرداری و ہوشیاری سے لے کر دربار میں حاضر ہو۔ یہ اطمینان کا تعویذ انہیں خانپور میں ملا۔ بڑا سہارا ہوگیا۔ ہمت بندھ گئی اور حضور میں پہنچے۔

اس لٹے قافلے کے واسطے وہ وقت عجیب مایوسی اور حیرانی کا عالم ہوگا، جبکہ یا بازنور سب تباہی زدوں کو لے کر آگرہ پہنچے ہوں گے۔ عورتوں کو محل میں اتارا ہوگا۔ اس یتیم بچے کو جس کا باپ ایک دن دربار کا مالک تھا، بادشاہ کے سامنے لا کر چھوڑ دیا ہوگا۔ اندیشہ پائی عورتوں کے دل دھکڑ دھکڑ، باہر اس کے قدیمی نمک خوار دعائیں کرتے ہوں گے کہ الہی باپ کی خدمتوں کو پیش نظر لائیو۔ آخری وقت کی باتوں کو دل سے بھلائیو۔ اس معصوم کے اور ہمارے حال پر مہربان رہیو۔ الہی سارا دربار دشمنوں سے بھرا ہے اس بن باپ کے بچے کا کوئی نہیں۔ ہماری زندگی اور آئندہ کی بہبودی

کا سہارا کون ہے ؟ اگر ہے تو اسی بچے کی جان ہے۔ تو ہی اسے پروان اور تو ہی اس بیل کو منڈھے چڑھائے گا۔

چغتائی سلسلہ میں ان چند بادشاہوں کا حال خطا بخشی کے معاملہ میں قابل تعریف ہے۔ دشمن بھی سامنے آتا تھا تو آنکھ جھپک جاتی تھی بلکہ اس کی جگہ خود شرمندہ ہو جاتے تھے۔ خطا کا ذکر نہ تھا۔ بھلا یہ تو بچہ معصوم تھا وہ بھی بیرم کا بیٹا۔ جس وقت سامنے لائے اکبر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ گود میں اٹھا لیا۔ اس کے نوکروں کے لئے وظیفے اور تنخواہیں بیش قرار مقرر کیں، اور کہا کہ اس کے سامنے کوئی خان بابا کا ذکر نہ کرو۔ بچہ ہے دل کڑھے گا۔ بابا زنبور نے رو کر کہا کہ حضور یہ بار بار پوچھتے ہیں۔ راتوں کو چونک اٹھتے ہیں، کہ کہاں گئے ؟ اب تک کیوں نہیں آئے۔ اکبر نے کہا "کہہ دیا کرو حج کو گئے ہیں۔ خانہ خدا میں پہنچ گئے'۔ بچہ ہے باتوں میں بہلا لیا کرو۔ دیکھو اسے ہر طرح خوش رکھو' اسے یہ نہ معلوم ہو کہ خان بابا سر پر نہیں۔ بابا زنبور۔ یہ ہمارا بیٹا ہے' اسے ہمارے پیش نظر رکھا کرو"

۹۶۹ھ ہجری میں یہ واجب الرحم بچہ دربار اکبری میں پہنچا تھا۔ اس کے باپ کے جانی دشمن اب ارکان دولت تھے۔ وہ یا ان کے خوشامدی ہر وقت حضور میں رہتے تھے۔ اکثر ایسے تذکرے کرتے تھے جن سے بیرم خاں کی باتیں اکبر کو یاد آئیں، اور اس طرف سے

کھٹک جائے ۔ اکثر ان میں سے کُھلم کھلا سمجھاتے تھے۔ لیکن اکبر کی نیک نیتی اور اس لڑکے کا اقبال تھا، کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ بلکہ غیروں کے دل میں ان باتوں سے رحم پیدا ہوتا تھا ۔ اکبر اسے مرزا خاں کہا کرتا تھا کہ ابتدائی ذکر میں اسے اہل تاریخ اکثر مرزا خاں ہی لکھتے ہیں ۔

ہونہار لڑکا اکبری سایہ میں پرورش پانے لگا اور بڑا ہوکر ایسا نکلا کہ مورخ اس کی لیاقت علمی کی گواہی دیتے ہیں بلکہ غنیمت سے زیادہ تیزی فکر اور قوت حافظ کی تعریف لکھتے ہیں۔ علوم و فنون کی کیفیت اور اثنائے تحصیل اور حد تحصیل کی شرح کسی نے نہیں کھولی۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ابتدائے عمر کو امیر زادوں کی طرح کھیل کود کر برباد نہیں کیا۔ چونکہ جب بڑا ہوا تو علم کا قدر داں تھا۔ اہل تصنیف اور شعرا کو عزیز رکھتا تھا۔ خود بھی شاعر تھا۔ زبان عربی سے واقف تھا، اور بے تکلف بولتا تھا۔ زبان تُرکی اور فارسی جو اس کے باپ دادا کی میراث تھی، اُسے جانے نہ دیا۔ حاضر جواب، لطیفہ گو، بذلہ سنج بلبل ہزار داستاں تھا۔ سنسکرت میں بھی اچھی لیاقت حاصل کی تھی۔ فن جنگ میں اعلیٰ درجہ کی قابلیت رکھتا تھا۔

اس کے باپ کے چند وفادار جاں نثار ساتھ تھے۔ جو محبت کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے اور اپنی قسمتوں کو اس ہونہار باقبال کے ہاتھ بیچے بیٹھے تھے۔ اس اُمید پر کہ اس کے ہاں ہمیشہ رہیں گے تو ہمارے

گھر میں بھی پڑنا لے گرینگے۔ حرم سرا میں کچھ شریف زادیاں اور پرستاریں تھیں جو وفاداری کے ساتھ بے کسی اور بے بسی کی چادروں میں لپٹی بیٹھی تھیں۔ حسرت و ارمان، اُمید و نااُمیدی، ان کے خیالوں میں ایک طلسمات بناتی تھی، بگاڑتی تھی۔ بادشاہی دربار خدائی عجائب خانہ تھا۔ امرا اور سردار کر وہاں سے جواہر کی پتلیاں بن کر نکلتے تھے۔ اس کے رفیق دیکھتے تھے اور رہ جاتے تھے۔ دل میں کہتے تھے، ایک دن اس کا باپ جس کو چاہتا تھا، اُسے جواہرات اور موتیوں میں چھپا دیتا تھا۔ کاش بیٹا ویسے انعاموں میں بھی شامل ہو جائے۔ اس میں سب قدرت ہے۔ وہ چاہے تو پھر وہی تماشا دکھائے۔ دن، رات، صبح، شام، آدھی رات آسمان کی طرف ہاتھ تھے، اور خدا کی طرف دھیان تھے۔ دل میں آمین آمین کہہ رہے تھے۔

حالی

آپ کے حالات صفحہ ۴۷ پر درج ہیں ۔

اُردو نثر نگاروں میں حالی کا مرتبہ بہت بلند ہے ۔

انداز بیان سیدھا سادہ واضح صاف اور سلجھا ہوا ہوتا ہے ۔

سادگی ، سلاست ، روانی اور تاثیر آپ کی تحریر کی نمایاں

خصوصیت ہے ۔

یہاں علم سے ہماری مراد مجرد علم ہے جو عمل سے بالکل خالی ہو اور عمل سے مراد محض عمل ہے جس میں علم کو کچھ دخل نہ ہو۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے۔

اگر ہم کو یہ دریافت کرنا ہو کہ چراغ کی بتی کا اشتعال آکسیجن سے قائم رہتا ہے یا ہائیڈروجن سے یا دونوں سے تو ہم کو چاہیئے کہ ایک دفعہ بتی کو محض آکسیجن میں اور دوسری دفعہ محض ہائیڈروجن میں رکھ کر دیکھیں۔ اگر دونوں میں بجھ جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ ہوا کے دونوں جزو ں کو اس کے اشتعال میں دخل ہے اور اگر ہائیڈروجن میں بجھ جائے اور آکسیجن میں نہ بجھے تو جاننا چاہیئے کہ اس کے اشتعال کا باعث محض آکسیجن ہے نہ کہ ہائیڈروجن۔

اسی طرح اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ دنیا کی کل علم سے چلتی ہے

یا عمل سے، تو ہم کو چاہیئے کہ اول ایک ایسا ملک فرض کریں جس میں اہل علم و اہل نظر کے سوا کوئی کام کرنے والا اور ہاتھ پاؤں ہلانے والا نہ ہو، اور پھر دیکھیں کہ وہ ملک کے دن آباد رہتا ہے۔ پھر ایک دوسرا ملک فرض کریں جس میں اَن پڑھ محنتی مزدوروں کے سوا اہل علم کا نشان نہ ہو، اور پھر دیکھیں کہ وہ ملک آباد رہتا ہے یا نہیں۔

اسی لئے ہم اول ایک ایسا خطّہ فرض کرتے ہیں جس کے باشندے جغرافی عالم، فلسفی، ریاضی داں، مصنّف، اور بڑے شاعر اور کیا کیا ہیں۔ مگر ان میں کوئی خدا کا بندہ ایسا نظر نہیں آتا جو ان واجب التعظیم اپاہجوں کے کھانے، پہننے، اوڑھنے، رہنے سہنے، لکھنے پڑھنے وغیرہ کا سامان مہیّا کرے۔ اول تو کسی ملک میں بغیر کارکن جماعتوں کے ایسی آبادی کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہے، لیکن اگر بفرض محال کسی خطّہ میں ایسی ناشدنی کالونی چند روز کے لئے آباد ہو جائے تو اس کا انجام کیا ہوگا؛ ممکن ہے کہ بعض کو مطالعہ کے ذوق و شوق میں ایک آدھ روز بھوک پیاس نہ لگے، بعض کو کسی مشکل مسئلہ کے حل ہو جانے کی خوشی میں ایک دو روز کھانے کی کچھ پروا نہ رہے اور بعض کو کسی مضمون کی دھن میں کچھ دیر تک خورد و نوش کا مطلق خیال نہ آئے۔ مگر بہت جلد وہ آپ کو ایک ایسی مخلوق پائیں گے جو بھوکی ہے مگر کوئی اس کا رزّاق نہیں، ننگی ہے مگر کوئی اس کا ستّار نہیں، حاجت مند ہے مگر کوئی

اُس کا قاضی الحاجات نہیں۔ اب یا تو اُنہیں خود اپنے اعلیٰ اور اشرف
ہاتھوں سے وہ تمام حقیر اور ذلیل کام سرانجام کرنے پڑیں گے جو عوام
کالانعام کو کرنے چاہئیں اور یا فوراً اس ملک سے ہجرت کرکے کسی
ایسے خطہ میں جاکر رہنا پڑے گا جہاں اُن کے لئے فرمانبردار بندے
پابندہ پرور خدا موجود ہوں۔ دونوں حالتوں میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ دنیا
کی کل محض علم سے نہیں چل سکتی"۔

اس کے بعد ہم ایک دوسرا ملک فرض کرتے ہیں جس کے تمام
باشندے اَن پڑھ اور بے علم مگر سب پرلے درجہ کے محنتی، جفاکش
اور اپنی ضروریات زندگی کے مہیا کرنے میں سرگرم ہیں۔ گو انہوں
نے زراعت یا تجارت یا صنعت و دستکاری کے اصول کتابوں میں
نہیں پڑھے مگر وہ اپنی تمام ضروریات جن پر انسان کی زندگی موقوف
ہے، مہیا کرتے ہیں۔ قدرتی خواہشیں اور نیچرل ضرورتیں اُن کو جس
طرح سکھاتی گئیں اور متواتر تجربوں سے جس قدر ان کی سمجھ بوجھ بڑھتی
گئی وہ اپنے تمام کام برابر سرانجام کرتے رہے۔ بونا، جوتنا، بنج
بیوپار، صنعت اور دستکاری غرض کہ تمام اہم اور ضروری کام
رفتہ رفتہ بقدر ضرورت انجام دینے لگے۔ اب ان کی کوئی ضرورت
بند نہیں رہتی اور کوئی کام اٹکا نہیں رہتا۔ ایک اناج پیدا کرکے
لاتا ہے، دوسرا پیستا ہے، تیسرا پکاتا ہے اور تینوں مل کر کھاتے

ہیں۔ ایک روئی پیدا کرتا ہے، دوسرا کاتتا ہے، تیسرا بنتا ہے، چوتھا بیتتا ہے اور چاروں مل کر پہنتے ہیں۔

ان کو چوری یا ڈکیتی کا مطلق خوف نہیں، کیونکہ ان کے پاس اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت کے سوا کوئی دولت نہیں۔ اُن کو غنیم کے حملے کا کچھ ڈر نہیں، کیونکہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے چوکس اور غنیم کے مقابلے کے لئے مستعد اور تیار ہیں، ان میں کوئی بدکار اور بدچلن نہیں، کیونکہ ان کو اپنے کام دھندوں میں بدکاری اور بدچلنی کی فرصت نہیں۔ ان میں کوئی روگی اور بیمار نہیں، کیونکہ ان میں کوئی طبیب اور ڈاکٹر نہیں، ان میں کوئی مذہبی تکرار نہیں، کیونکہ ان میں کوئی واعظ یا ملا نہیں۔ ان میں کوئی پولیٹکل اختلاف نہیں، کیونکہ وہ سب کنسرویٹو ہیں۔ کوئی اُن میں روشن خیال لبرل نہیں۔ اُن میں کوئی عدالتی جھگڑا نہیں، کیونکہ ان میں کوئی وکیل اور بیرسٹر نہیں۔ اُن میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ سولائزڈ نہیں۔ اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کی کل عمل سے چلتی ہے نہ کہ علم سے۔

اب فرض کرو کہ اس ملک کے باشندوں کا میل جول کسی ایسے ملک والوں سے ہوا جن کے تمام کام علمی اصول پر مبنی ہیں۔ انہوں نے زراعت، تجارت، صنعت و دستکاری اور تمام جنگی اور ملکی مہمات میں علم ہی کو اپنا رہبر بنایا ہے۔ کیا لُہار اور کیا بڑھئی، کیا لوہار اور کیا

کمہار، کیا درزی اور کیا کفش دوز، غرضکہ تمام پیشہ ور محض علم کی ہدایت سے اپنے اپنے کام سرانجام کرتے ہیں۔ ان کے میل جول اور لین دین نے اس ملک کے غریب باشندوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ اُن کی تجارت نے اُن کے اخراجات زندگی حد سے زیادہ بڑھا دیئے۔ اُن کی صنعت نے اِن کی صنعت ماند ہو گئی۔ اُن کی دستکاری نے اِن کی دستکاری کو ماند کردیا۔ مگر ایک مدت تک اُن کو اس بات کی خبر نہ ہوئی کہ ہمارے پیشہ ور کیوں بیکار ہو گئے۔ ہماری کمائیوں میں برکت کیوں نہیں رہی۔ ہمارے اخراجات روز بروز کیوں بڑھتے جاتے ہیں اور ہماری آمدنی ہمارے اخراجات کو کیوں مکتفی نہیں ہوتی۔ لیکن اس غیر قوم سے جوں جوں میل جول بڑھتا گیا اُن کو اِن کی اور اِن کو اُن کی زبان سیکھنے کی ضرورت زیادہ ہوتی گئی۔ اُنہوں نے اول اِن کی زبان سیکھی۔ پھر رفتہ رفتہ اُن کے علم بھی سیکھنے لگے۔ جن علموں کے ذریعہ سے انہوں نے ہر فن میں ترقی کی تھی، وہ علم بھی انہوں نے حاصل کئے، مگر کتابی علم کے سوا کوئی عملی فائدہ اُن کے علموں سے نہ اُٹھایا۔ وہ علم کو عمل کی غرض سے سیکھتے تھے اور اُنہوں نے علم کو محض علم کے واسطے سیکھا وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ علم آدمی کے لئے بنا ہے۔ وہ علم سے خود بھی لذت اور فائدہ اُٹھاتے تھے اور اپنے ملک اور قوم کو بھی لذت اور فائدہ پہنچاتے تھے۔ اِنہوں نے گونگے کی طرح گڑ کھایا اور

کسی نے سمجھا کہ کھٹا ہے یا میٹھا۔ وہ دنیا کی مختلف زبانیں اس لئے سیکھتے تھے کہ تمام عالم میں پھرتے تھے، غیر ملکوں کے آدمیوں سے ملتے جلتے، مختلف قوموں کے علوم و فنون سے آگاہی حاصل کرتے تھے اور اُن کو اپنی زبان میں نقل کرتے تھے۔ انہوں نے بھی اُن کی دیکھا دیکھی غیر ملکوں کی زبانیں اور غیر قوموں کی بولیاں سیکھیں مگر نہ اس لئے کہ غیر ملکوں میں سفر کریں اور غیر قوموں کے علوم و فنون اپنی زبان میں نقل کریں بلکہ اس لئے کہ طوطے کی طرح کہیں " حق اللہ پاک ذات اللہ " بول اٹھیں اور کہیں " مونسٹ گورڈنٹ ڈاتا "۔ وہ لیمپ روشن کرنے کے لئے۔ میز لکھنے کے لئے، کرسی بیٹھنے کے لئے، گھنٹا وقت دیکھنے کے لئے، فرش بچھانے کے لئے خریدتے تھے۔ انہوں نے بھی اُن کی ریس سے یہ سب چیزیں فراہم کیں مگر لیمپ کو جلایا نہ میز پر لکھا، نہ کرسی پر بیٹھے، نہ گھنٹے میں وقت دیکھا، نہ فرش بچھایا۔ بلکہ کباڑی کی طرح سارا گھر اسباب سے بھر لیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو گئی۔ علم کے ذوق شوق میں انہوں نے ہاتھ پاؤں ہلانے بالکل چھوڑ دیئے اور علم کا ادب ان کو دنیا کے ذلیل کاموں میں ہاتھ ڈالنے سے مانع ہوا۔ اب تاوقتیکہ وہ علم کو عمل کی غرض سے نہ پڑھیں اور اس سے عملی فائدے نہ اٹھائیں، ممکن نہیں کہ ان کی حالت درست ہو۔ اس سے صاف

ظاہر ہے کہ دنیا کی کل علم سے نہیں چلتی بلکہ عمل سے چلتی ہے۔ اس کی تمثیل سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم کو علم کی ضرورت نہیں، بلکہ ہم کو اس وقت علم کی نہایت ضرورت ہے، اور ایسی ضرورت جیسے پیاسے کو ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح ٹھنڈے پانی سے کلیاں کرنے سے پیاس نہیں بجھتی بلکہ اور زیادہ آگ بھڑکتی ہے اسی طرح سطحیوں کی مانند کتابوں کے الفاظ اور عالموں کی اصطلاحیں یاد کرنے سے کوئی شخص آپ کو اور ملک کو کوئی اصلی فائدہ نہیں پہنچا سکتا بلکہ اندیشہ ہے کہ ایسے لوگ ملک کے حق میں مضر ثابت نہ ہوں۔ جس علم کی ہم کو ضرورت ہے وہ علم ہے جو ہماری ساکن اور پژمردہ قوموں کو متحرک اور شگفتہ و شاداب کرے، نہ وہ علم جو ہمارے متحرک اور شگفتہ قوی کو بھی ساکن اور پژمردہ کر دے۔ ایسے علم سے بے علمی سو درجہ بہتر ہے۔ بقول شخصے "بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی جئے گا"۔

شبلی

شبلی ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے۔ سرسید نے آپ کو علی گڈھ کالج کا پروفیسر مقرر کیا۔ سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸۹۶ء میں پروفیسری سے استعفا دیدیا اور اعظم گڈھ میں مستقل قیام کر کے تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔ آپ بیک وقت مؤرخ، شاعر، نقاد اور متبحر عالم تھے۔

آپ کا انداز تحریر صاف اور واضح ہے۔ اس میں عالمانہ سنجیدگی اور منطقی استدلال پایا جاتا ہے۔ تحریر شگفتہ، دلکش اور عام فہم ہے۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں اعظم گڈھ میں انتقال کیا۔

۹

قسطنطنیہ کے مختصر حالات

قبل اس کے کہ میں یہاں کے تفصیلی حالات جُدا جُدا عنوان سے بیان کروں۔ ضرور ہے کہ نہایت مختصر طور پر اس کی قدیم تاریخ اور اس کے ساتھ اس کی عام موجودہ حالت اجمال کے ساتھ بیان کروں۔ اس شہر کی ابتدائی تاریخ (یعنی جب وہ بزنطائن کے نام سے پُکارا جاتا تھا) نہایت قدیم ہے۔ لیکن جس زمانے سے اس کا نام قسطنطنیہ ہے اس کو بھی کچھ کم عرصہ نہیں گزرا۔ ۳۲۷ء میں قسطنطین اعظم نے اس کی بنیاد ڈالی اور اس وقت سے محمد فاتح کے زمانے تک وہ قیصران روم کا پایۂ تخت رہا۔ انگریزی اور حال کے اسلامی جغرافیوں میں اس کے حالات نہایت تفصیل سے ملتے ہیں۔ قدیم اسلامی جغرافیوں میں بھی اس کا ذکر ہے۔ لیکن ابن بطوطہ کے سوا مجھ کو کوئی اسلامی مصنّف معلوم نہیں جس نے اس زمانے کے

واقعات چشم دید لکھے ہوں۔ ابن بطوطہ نے ۷۲۵ھ میں اس شہر کو دیکھا۔ اس وقت یہاں عیسائی حکومت تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ "یہ نہایت عظیم الشان شہر ہے اور نہر کے حائل ہونے کی وجہ سے دو حصّوں میں منقسم ہو گیا ہے۔ ایک حصّہ جو نہر کے شرقی کنارے پر ہے استنبول کہلاتا ہے۔ اور قیصر روم اور ارکان دولت و اُمرا اسی حصّے میں رہتے ہیں دوسرا حصّہ غلطہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں عموماً یورپ کے بڑے بڑے تاجر رہتے ہیں۔ جن کو قیصر زر اپنی اطاعت میں رکھتا ہے" ابن بطوطہ نے ان سوداگروں کی وسعت تجارت کی تعریف اور ان کے عجلے پن کی ہجو کی ہے وہ لکھتا ہے کہ جب میں اس شہر میں داخل ہوا تو چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے علاوہ قریبا سو بڑے بڑے جہاز موجود تھے۔ بلکن تمام بازار نہایت نجس اور کثیف ہے اور گرجے تک اس سے مستثنےٰ نہیں۔

مسلمانوں نے اس کو قرن اوّل ہی میں تسخیر کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ چنانچہ سب سے اول جس نے اس کی شہر پناہ کے آہنی دروازے پر نیزہ مارا وہ عبداللہ بن المطلب۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک کا سپہ سالار تھا۔ اس کے بعد اور خلفا و سلاطین نے بھی اس پر حملے کیے لیکن قیصران روم کا خاتمہ محمد فاتح کے ہاتھ سے ہونے والا تھا جس نے ۸۵۷ھ میں اس

عظیم الشان دارالسلطنت پر صلیب کی بجائے علم الاسلام بلند کیا۔ اس حیرت انگیز معرکہ کی یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ چونکہ عیسائیوں نے بندرگاہ کا راستہ دریا کی طرف سے روک رکھا تھا۔ ترکوں نے باسفورس اور گولڈن ہارن کے درمیان جو سنگلاخ زمین ہے اس پر پانچ میل تک لکڑی کے تختے بچھا دیئے اور جہازوں کو جن میں پہیئے لگا دیئے گئے اس پر چلا کر تمام فوجیں گولڈن ہارن میں اُتار دیں۔ اُس وقت اس نامور فاتح کی عمر کل ۲۲ برس کی تھی۔ اس فتح کا مادہ تاریخ "بَلْدَۃٌ طَیِّبَۃٌ" ہے۔

لباس اور وضع بالکل یوروپین ہے۔ ظاہری ہیئت سے کسی شخص کا مسلمان یا عیسائی ہونا معلوم نہیں ہو سکتا۔ لال ٹوپی جو ترکوں کا امتیازی لباس ہو سکتا تھا عیسائی اور یہودی سبھی استعمال کرتے ہیں اور اس وجہ سے دونوں قوموں میں امتیاز کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یہ طریقہ ایک اعتبار سے تو اچھا ہے کیونکہ دنیا کی مختلف قوموں میں اختلاف کے آثار جس قدر مٹتے جائیں تمدن کے لئے مفید ہیں۔ لیکن شوشل ضرورتوں میں اس سے سخت ہرج ہوتا ہے۔ مجھ کو اس کی وجہ سے اکثر دشواریاں پیش آئیں اور ہمیشہ خیال آتا تھا کہ حضرت عمرؓ نے اگر عیسائیوں کو قومی لباس کی پابندی کا حکم دیا تھا تو بہت اچھا کیا۔ تعجب یہ ہے کہ یہاں مذہبی گروہ یعنی علماء اور مدرسین بھی یورپ

کے اثر سے نہیں بچ سکے۔ ان کے پائجاموں میں پتلون کی طرح بٹن ہوتے ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ اوپر گھیر ہوتا ہے اور خوبصورتی کے ساتھ چنٹیں ہوتی ہیں۔ کرتا یا اچکن کے بجائے صرف ویسکوٹ ہوتا ہے ویسکوٹ کے اوپر عبا پہنتے ہیں اور یہی امتیازی علامت ہے جو ان کو اور گروہ کے آدمیوں سے الگ کرتی ہے۔ ان میں بھی یورپ کا یہ اثر ہے کہ عبا کے تکمے نہیں لگاتے اور سامنے سے ویسکوٹ کھلا رہتا ہے۔ ترکی ٹوپی یہ لوگ بھی استعمال کرتے ہیں لیکن اس پر سپید کپڑے کی ایک دھجی لپٹی ہوتی ہے، جس کو عربی میں لفہ کہتے ہیں اور وہ اہل علم کی خاص علامت خیال کی جاتی ہے۔

یہاں کی عمدہ اور یادگار عمارتیں۔ جامع مسجدیں اور شاہی ایوانات ہیں۔ جامع مسجدوں کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ جداگانہ عنوان سے آئیگا۔ شاہی ایوانات کو یہاں سرائے کہتے ہیں۔ ان کی تعداد بیس یا اکیس ہے اور سب دور دور فاصلہ پر واقع ہیں۔ یہ عمارتیں مختلف سلاطین کے عہد کی ہیں۔ اور نہایت عظمت و شان کی عمارتیں ہیں۔ ایک ایوان لب دریا ہے جو سرتاپا سنگ رخام کا ہے اور نہایت وسیع بلند خوش نما ہے۔ حال میں شہنشاہ جرمن سلطان کا مہمان ہوا تھا تو اسی ایوان میں ٹھیرا تھا۔

یہ بات نہایت تعجب کی ہے کہ تمام شہر میں کوئی ٹاؤن ہال نہیں پبلک گارڈن یعنی (باغ عامہ) بھی ایسا مختصر ہے کہ اس عظیم الشان دارالسلطنت کے لئے کسی طرح موزوں نہیں عدالتیں (بجز دو تین کے) سب یکجا واقع ہیں اور اس مجموعی عمارت کو باب عالی کہتے ہیں۔ وزیر اعظم کا محکمہ بھی یہیں ہے۔ یہ عمارتیں چنداں شاندار نہیں ہیں۔ ہائی کورٹ جس کو یہاں محکمۂ التمیز کہتے ہیں۔ باب عالی سے فاصلے پر ہے۔ میں اس کے اندر تو نہیں گیا لیکن باہر سے بڑی شاندار عمارت معلوم ہوتی ہے۔ پولیس کمشنر کی عدالت غلطہ میں ہے۔ میں نے اس کی اچھی طرح سیر کی۔ عمارت چنداں قابل ذکر نہیں ہے لیکن نہایت مرتب اور آراستہ ہے۔ اجلاس کے کمرے میں بیش قیمت ترکی قالین بچھا ہوا ہے۔ کرسیاں بھی نہایت خوبصورت اور موزوں ہیں۔ معارف یعنی سررشتہ تعلیم کا محکمہ بھی میں نے دیکھا۔ معمولی عمارت ہے۔ لیکن صفائی اور خوش سلیقگی کی وجہ سے خوشنما معلوم ہوتی ہے۔

حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔
اردو کے کامیاب اور مقبول مصنف تھے۔ تحریر میں
بے ساختگی اور بے تکلفی ہے۔ معمولی سے معمولی بات کو جدت
کے ساتھ بیان کرنے میں کمال حاصل ہے۔ فطرت کی تصویر کھینچنے
میں بے مثال ہیں، اس لئے مصورِ فطرت کہے جاتے ہیں۔
۱۹۵۵ء میں رحلت فرمائی۔

۱۰

زینت بہادر شاہ

جس رات میرے باباجان کی بادشاہت ختم ہوئی اور تاج و تخت لینے کا وقت آیا تو دلی کے لال قلعہ میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ در و دیوار پر حسرت برستی تھی۔ اُجلے اُجلے سنگ مرمر کے مکان کالے سیاہ نظر آتے تھے۔ تین وقت سے کسی نے کچھ نہ کھایا تھا۔ زینب میری گود میں تین سال کی بچّی تھی اور دودھ کے لئے بلکتی تھی۔ فکر اور پریشانی کے مارے نہ میرے دودھ رہا تھا اور نہ کسی انا کے۔ ہم سب اسی یاس، ہراس کے عالم میں بیٹھے تھے کہ حضرت ظل سبحانی کا خاص خواجہ سرا ہم کو بلانے آیا۔ آدھی رات کا وقت، سناٹے کا عالم لوگوں کی گرج سے دل ہمے جاتے تھے۔ لیکن حکم سلطانی ملتے ہی حاضری کے لئے روانہ ہوگئے۔ حضور مصلّے پر تشریف رکھتے تھے۔ تسبیح ہاتھ میں تھی۔ جب میں سامنے پہنچی جھک کر تین مجرے

بجالائی۔ حضور نے نہایت شفقت سے قریب بلایا اور فرمانے لگے
لو اب تم کو خدا کو سونپا۔ قسمت میں ہے تو پھر دیکھ لیں گے تم اپنے
خاوند کو لے کر چلی جاؤ۔ میں بھی جاتا ہوں۔ جی تو نہیں چاہتا کہ اس
آخری وقت میں تم بچوں کو آنکھ سے اوجھل ہونے دوں۔ پر
کیا کروں ساتھ رکھنے میں تمہاری بربادی کا اندیشہ ہے۔ الگ
رہو گی تو شاید خدا کوئی بہتر سامان پیدا کر دے۔

اتنا فرما کر حضور نے دست مبارک دعا کے لئے بلند کئے
جو رعشہ کے سبب کانپ رہے تھے۔ دیر تک آواز سے بارگاہ الٰہی
میں عرض کرتے رہے، خداوند یہ بے وارث بچے تیرے حوالے
کرتا ہوں۔ یہ محلوں کے رہنے والے جنگل ویرانوں میں جاتے ہیں
دنیا میں ان کا کوئی یار و مددگار نہیں۔ تیمور کے نام کی عزت رکھیو
اور ان بیکس عورتوں کی آبرو بچائیو۔ پروردگار یہی نہیں تمام
ہندوستان کے ہندو مسلمان میری اولاد ہیں اور آج کل سب
مصیبت چھائی ہوئی ہے۔ میرے اعمال کی شامت سے ان کو
رسوا نہ کر اور سب کو پریشانیوں سے نجات دے۔

اس کے بعد میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ زینب کو پیار کیا اور
میرے خاوند مرزا ضیاء الدین کو کچھ جواہرات عنایت کئے نور محل
کو بھی ہمراہ کر دیا جو حضور کی بیگم تھیں۔

پچھلی رات کو ہمارا قافلہ قلعہ سے نکلا، جس میں دو مرد اور تین عورتیں تھیں۔ مردوں میں ایک میرے خاوند مرزا ضیاء الدین اور دوسرے مرزا عمر سلطان، بادشاہ کے بہنوئی تھے۔ عورتوں میں ایک میں دوسری نواب نور محل تیسری حافظ سلطان، بادشاہ کی سمدھن تھیں۔ جس وقت ہم لوگ رتھ میں سوار ہونے لگے، صبح صادق کا وقت تھا۔ تارے سب چھپ گئے تھے مگر فجر کا تارا جھلملا رہا تھا، ہم نے اپنے بھرے پرے گھر پہ اور سلطانی محلوں پر آخری نظر ڈالی تو دل بھر آیا اور آنسو امنڈنے لگے۔ نواب نور محل کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور پلکیں ان کے بوجھ سے کانپ رہی تھیں۔ گویا صبح کے تارے کا جھلملانا نور محل کی آنکھوں میں نظر آتا تھا۔

آخر کار لال قلعہ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو کر کورالی گانوں میں پہنچے اور وہاں اپنے رتھ بان کے مکان پر قیام کیا۔ باجرے کی روٹی اور چھاچھ کھانے کو میسر آئی۔ اور اس وقت بھوک میں یہ چیزیں بریانی و متنجن سے زیادہ مزیدار معلوم ہوئیں۔ ایک دن رات تو امن سے بسر ہوا دوسرے دن گرد و نواح کے جاٹ گوجر جمع ہو کر کورالی کو لوٹنے چڑھ آئے۔ سینکڑوں عورتیں بھی ان لیڑوں کے ساتھ تھیں جو چڑیلوں کی طرح ہم کو چمٹ گئیں۔ تمام زیور اور کپڑے

ان کمبختوں نے اُتار لیئے۔ جس وقت یہ بڑی بسی عورتیں اپنے موٹے موٹے میلے
ہاتھوں سے ہمارے گلے کو نوچتی تھیں کہ ان کے لہنگوں سے ایسی بو آتی تھی
کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔

اس لوٹ کے بعد ہمارے پاس اتنا بھی باقی نہ رہا جو ایک وقت
کی روٹی کو کافی ہو سکتا۔ حیران تھے کہ اب کیا پیش آئے گا۔ زینب پیاس
کے مارے رو رہی تھی۔ سامنے سے ایک زمیندار نکلا۔ میں نے بے اختیار
ہو کر آواز دی بھائی تھوڑا پانی اس بچی کو لادے۔ زمیندار فوراً ایک
مٹی کے برتن میں پانی لایا اور بولا آج سے تو میری بہن ہے اور میں تیرا
بھائی۔ یہ زمیندار کورال کا کھاتا پیتا آدمی تھا۔ اس کا نام بستی تھا۔
اس نے اپنی بیل گاڑی تیار کر کے ہم کو سوار کرایا اور پوچھا کہ جہاں تم کہو
پہنچا دوں۔ ہم نے کہا کہ اجاڑہ ضلع میرٹھ میں میر فیض علی شاہی حکیم رہتے
ہیں جن سے ہمارے خاندان کے خاص مراسم ہیں وہاں لے چل۔ بستی
ہم کو اجاڑہ لے گیا۔ مگر میر فیض علی نے ایسی بے مروتی کا برتاؤ کیا
جس کی کوئی حد نہیں۔ صاف کانوں پر ہاتھ رکھ لیے کہ تم لوگوں کو
ٹھیرا کر اپنا گھر بار تباہ و برباد کرنا نہیں چاہتا۔

وہ وقت بڑی مایوسی کا تھا۔ زمین آسمان میں کہیں ٹھکانا
نظر نہ آتا تھا۔ ایک تو یہ خطرہ کہ پیچھے سے انگریزی فوج آتی ہوگی۔
اس پر بے سروسامانی کا یہ عالم۔ ہر شخص کی نگاہ پھری ہوئی تھی۔ وہ

لوگ جو ہماری آنکھوں کے اشاروں پر چلتے اور ہر وقت دیکھتے رہتے تھے کہ ہم جو کچھ حکم دیں فوراً کیا جائے وہی آج ہماری صورت سے بیزار تھے۔ شاباش ہے بستی زمیندار کو کہ اس نے نقطہ زبانی بہت کہنے کو آخر تک نباہا۔ اور ہمارا ساتھ نہ چھوڑا۔ لاچار اجاڑہ سے روانہ ہوئے اور حیدرآباد کا رُخ کیا۔ عورتیں بستی کی گاڑی میں سوار تھیں اور مرد پیدل چلتے تھے۔ تیسرے روز ایک ندی کے کنارے پہنچے جہاں کوٹل کے نواب کی فوج پڑی تھی انہوں نے سُنا کہ شاہی خاندان کے آدمی ہیں تو بڑی خاطر اور مدارات کی اور ہاتھی پر سوار کر کے ندی کے پار اُتارا۔ ابھی ہم ندی کے کنارے پر اُترے ہی تھے کہ سامنے سے انگریزی فوج آگئی اور نواب کی فوج سے لڑائی ہونے لگی۔

میرے خاوند اور مرزا عمر سلطان نے چاہا کہ نواب کی فوج میں شامل ہو کر لڑیں مگر رسالدار نے کہلا بھیجا کہ آپ عورتوں کو لے کر جلدی چلے جائیے، ہم جیسا موقع ہوگا بھگت لیں گے۔ سامنے کھیت تھے جن میں پکی ہوئی تیار کھیتی کھڑی تھی۔ ہم لوگ اس کے اندر چھپ گئے۔ ظالموں نے خبر نہیں دیکھ لیا تھا یا ناگہانی طور پر گولی لگی۔ جو کچھ بھی ہو ایک گولی کھیت میں آئی جس سے آگ بھڑک اُٹھی اور تمام کھیت جلنے لگا۔ ہم لوگ وہاں سے نکل کر بھاگے۔ پر ہائے کیسی مصیبت تھی۔ ہم کو بھاگنا بھی نہ آتا تھا۔

گھاس میں اُلجھ اُلجھ کر گرتے تھے۔ سر کی چادریں وہیں رہ گئیں۔ برہنہ سر تو اس باختہ ہزار خرابی سے کھیت کے باہر آئے۔ میرے اور نواب نور محل کے ہاتھ خون خون ہو گئے۔ پیاس کے مارے زبانیں باہر نکل آئیں۔ زینب پر غشی کا عالم تھا۔ مرد کو ہم سنبھالتے تھے مگر ہمارا سنبھلنا مشکل تھا۔

نواب نور محل تو کھیت سے نکلتے ہی چکرا کر گر پڑیں اور بے ہوش ہو گئیں۔ بی زینب کو چھاتی سے لگائے اپنے خاوند کا منہ تک رہی تھی اور دل میں کہتی تھی کہ الٰہی ہم کہاں جائیں سہارا نظر نہیں آتا۔ قسمت ایسی پلٹی کہ شاہی سے گدائی ہو گئی۔ لیکن فقیروں کو بھی چین اور اطمینان ہوتا ہے، یہاں وہ بھی نصیب نہیں۔

فوج ذرا ہولی دور نکل گئی تھی۔ بستی نزدیک سے پانی لایا۔ ہم نے پیا اور نواب نور محل کے چہرے پر چھڑکا۔ نور محل نے ذرا آنکھ کھولی تو میں نے پوچھا۔ اچھی اماں جان اُٹھئے آپ کا کیا حال ہے؟ یہ سنکر نور محل رونے لگیں۔ اور بولیں ابھی خواب میں تمہارے بابا جان حضرت ظل سبحانی کو دیکھا ہے کہ طوق و زنجیر پہنے ہوئے کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ آج ہم غریبوں کے لئے یہ کانٹوں بھرا خاک کا بچھونا مخملی فرش سے بڑھ کر ہے۔ نور محل گھبرا نہیں ہمت سے کام لینا تقدیر میں لکھا تھا کہ بڑھاپے میں یہ سختیاں برداشت کروں۔ ذرا میری کلثوم کو دکھا دو۔

میں جیل خانہ جانے سے پہلے اس کو دیکھوں گا۔

بادشاہ کی باتیں سن کر بیں نے ہائے کا نعرہ مارا اور آنکھ
کھل گئی۔ کلثوم کیا سچ مچ ہمارے بادشاہ کو زنجیروں میں جکڑا گیا ہوگا
کیا واقعی وہ قیدیوں کی طرح جیل خانہ بھیجے گئے ہوں گے۔ مرز
عمر سلطان نے اس کا جواب دیا کہ یہ خواب و خیال ہے۔ بادشا
لوگ بادشاہوں کے ساتھ ایسی بدسلوکی نہیں کیا کرتے۔ تم گھبراؤ
نہیں۔ وہ اچھے حال میں ہوں گے۔

خیال

نصیر حسین نام خیال تخلص سنہ ۱۸۷۸ء میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ شعر و شاعری کے دلدادہ تھے۔ لیکن بعد میں نثرنگاری کی طرف مائل ہو گئے۔ آپ ایک کامیاب صحافی بھی تھے۔ اور ملک کے مقتدر رسالوں میں آپ کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ علمی، ادبی مشاغل کے علاوہ آپ کو سیاسی و تعلیمی تحریکوں سے بھی دلچسپی تھی۔

آپ کی انشاپردازی ایک خاص قسم کی تھی۔ اگرچہ محمد حسین آزاد کے معتقد تھے۔ پھر بھی تحریر سے انفرادیت نمایاں تھی۔

سنہ ۱۹۳۴ء میں رحلت فرمائی۔

۱۱

عربی اور ہندی

راجہ داہر کی جنگ و شکست پُرانی تاریخ ہند کا اخیر ورق عربی اور ترکی و ایرانی خروج کا دیباچہ اور غیر اقوام سے نئے ارتباط و تعلق اور پائدار رشتہ کے پیدا و قائم ہو جانے کا دلچسپ عنوان ہے اس ملک میں اب تک باہر کی بیٹیاں آئیں اور اپنی زبانیں ساتھ لائی تھیں۔ مگر اب ہوا اُلٹی اور ہند کی بیٹیاں بھی باہر نکلیں اور اس کھینچ کی بدولت زبانوں کا سکہ دونوں جگہ کرنسی ہونے اور چلنے لگا۔

قاسم تین برس سندھ میں رہا اور اپنی ملک داری کی بدولت یہاں پوجا گیا۔ اس کے اکثر ساتھیوں اور لشکریوں نے یہاں وطنیت کی اور گھر بنا کر رہے۔ اس کے جانے پر عرب کا قافلہ ٹوٹا اور بزار سندھ بزار عکاظ نظر آنے لگا۔ عرب فتح فارس سے بہت سبق سیکھ چکے تھے اور نو وارد دین کو غیر ملک میں جو دشواریاں پیش آیا کرتی ہیں

اس کا تجربہ رکھتے تھے۔ زبان کی دقتیں سب دقتوں پر ہمیشہ بالا ہوا کرتی ہیں وہ اسے خوب جھیل چکے تھے۔

اور جس ملک کو انہوں نے گونگا (عجم) کہا اس کے آلۂ زبان سے بھی آخر کام لے چکے تھے۔ یہاں کی مشکلیں ان کے لئے آسان تھیں انہوں نے بلا تعصب و حقارت اپنی مفتوحہ زبان کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اُسے بھی پہلو میں لا بٹھایا! اور خوش قسمتی تھی سندھ کی کہ اسے عرب جیسے فراخ دل و قدرداں ملے!۔

جنہوں نے محض اپنی زبان کا زور اور فاتحانہ قوت دکھانے اور صرف اپنے ہی ارگن (زبان) کو وقت نا وقت بجاتے رہنے کی ہوس میں کہیں کی شہنا (زبان) کا کلیجہ نہ چھیدا!۔

وہ خود صاحب زبان اور ادب (لٹریچر) کے مالک تھے۔ اس لئے وہ دوسری زبانوں اور دوسرے لٹریچر کی قدر کر سکتے تھے وہ جانتے تھے کہ کسی قوم کو الکن کر دینا اس کی ہستی کو معدوم کر دینا ہے اور اس لئے ان میں کوئی ایسا بیدرد پیدا نہ ہوا۔ جس نے اپنی ہوم گورنمنٹ کو کسی اسپیچ کے ذریعہ سے اس قوم کی زبان کی تحقیر و تذلیل کی! ان کی (عرب) زبان گو اس وقت علوم و فنون کی بہر لبن بنی ہوئی تھی مگر انہوں نے محض اپنی آسانیوں کی خاطر دوسروں کی گردنیں اُدھر نہ جھکائیں۔ وہ سمجھتے اور حق سمجھتے تھے کہ یہاں کی زمین کے شکم میں

خود شہد و شیر کی نہریں موجزن اور رہی ہیں۔ یہ ملک خود اپنے رواج (ٹریڈیشن) اور اپنا سویلزیشن رکھتا ہے اور اس کا ادب و لٹریچر دُنیا میں ممتاز رہا ہے اس لیے اس کی قدر کی اور ایک پُرانی قوم کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین نہ ہونے دیا!

دوسری طرف ہندی بھی غیر اقوام اور غیر زبانوں کے صدیوں سے عادی ہو رہے تھے۔ عربی نئی ہو مگر غیر زبانوں کا پھیٹ ان کی زبان سے خبر میں آچکا تھا۔ ان کا بیرونی لب و لہجہ اور حروف کے مختلف اصوات سے آشنا ہو چکے بلکہ ان کے حلق و دندان تک ان آوازوں کھنکوں اور شعبوں کے مخارج بن چکے تھے۔ اس کے علاوہ خود ان کے ملک میں کئی کئی زبانیں اس وقت تک رائج تھیں وہ انہیں بے تکلف سمجھتے اور بولتے بھی تھے۔

ایسے ہفت زبانوں کے لیے ایک عربی کیا مشکل تھی۔ انہوں نے اس کا بھی خیر مقدم کیا اور اپنے گھر میں اُسے بھی جگہ دی!

وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ حکومت کسی پیچدار اعتراض سے ہماری زبان کاٹنا نہیں چاہتی۔ وہ (حکومت) خود اس طرف بڑھ رہی ہے اور ہماری اس کی مشکل برابر کی ہے۔ انہیں (اہل ہند) اس کا بھی علم تھا کہ ہمارے فاتحین کی زبان پہلے ایک ہی سمندر رکھتی اور اب تو قلزم بن رہی ہے اس سے اپنے چشمے کی سوتوں کو ملانا اور پر کرنا چاہیئے

بے اطمینانیوں اور غلط فہمیوں کا راستہ کھلا نہ تھا۔ دونوں اپنے حدود کو سمجھ کر آگے بڑھے اور کوئی تصادم نہیں ہوا اور بولی عربی اور ہندی کی آمیزش شروع ہوگئی۔

یہ اس بے تکلفی و یکجہتی کا نتیجہ تھا کہ خلفائے عرب کے عظیم الشان دربار تک یہاں کے علما و فضلا، حکیموں اور پنڈتوں کی رسائی ہوئی اور اہل ہند کا اتنا اعتبار اور رسوخ بڑھا کہ ہارون الرشید نے کنکا نامک یا کبیراتح کو اپنے علاج کے لیے یہاں سے طلب کیا اور اسے عزت و افتخار کی کرسی بخشی۔

یہی وہ زمانہ ہے کہ عرب سیاح اس ملک کی سیر کو آتے اور یہاں سے خوش خوش جاتے ہیں۔ مسعودی بھی ان ہی دنوں میں ادھر آیا اور اس ملک اور اہل ملک کی تعریف کرتا ہوا واپس گیا۔ ابن حوقل جو اس کے بعد یہاں کی سیر کو آیا اور ہندو مسلمانوں کے رشتہ اتحاد کو خوشی مگر حیرت کے ساتھ دیکھتا اور کہتا ہے کہ ان دونوں قوموں (ہندو مسلمان) کے لباس، تمدن و معاشرت اور ان کی رفتار و گفتار میں فرق و امتیاز مشکل ہے۔ دونوں ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ ملتانی و فارسی عام ہے۔

جغرافیۂ قدیم کی رو سے سندھ برنج کا ڈنڈا ملا ہوا تھا اور اسی وجہ سے دیگر صوبجات سے زیادہ ان دونوں خطوں میں اختلاط

وم اہم تھے۔ مرزا برج کی کوئی یوں تو کہاں نہیں کوکی اور کس دل کو ان نے اپنی طرف نہیں کھینچا مگر سندھ اس کا پائیں باغ تھا۔ وہاں اس وقت سب سے زیادہ اثر پڑا۔ وہ بلبل ہند (بھاشا) جو باغ باغ اور چمن چمن کے پھول اپنی منقار میں لیے ہوئے تھی۔ جب اُڑکر اِدھر اُدھر پہنچی تو اپنے گلدستہ کے لیے عربی کے گل سرسبد بھی اس نے چنے اور اپنے آشیانے میں سجاکر رکھے۔

سندھی ہو یا یہاں کی اور پراکرتیں وہ غدر دو تفیں۔ لائق باغبانوں نے بھی انہیں ہاتھ نہیں لگایا اور نہ باہر کے بیٹنوں نے انہیں سینچا۔ اس لیے وہ مرجھائیں اور بے برگ و بار رہیں۔ برخلاف اس کے برج بھاشا کانٹ چھانٹ کر درست کی گئی۔ اور پھلدار و میوہ دار تھی۔ شعرا اور ادیبوں نے اس کی آبیاری کی وہ بڑھی، گھنی ہوئی اور ہر طرف چھاگئی، اور اور پراکرتوں کے ساتھ سندھی بھی اس سے دبی اور آخر اسی کے زیر سایہ رہنے لگی۔

ماہیوری

نور محمد نام آنجم تخلص۔ آبائی وطن مان پور (ضلع گیا) کی نسبت سے مانپوری مشہور ہوئے۔ ۱۸۸۱ء میں مانپور میں پیدا ہوئے۔
تعلیم سے فارغ ہو کر آبائی پیشہ تجارت کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر اس سے علحدہ ہو کر مختلف رسائل کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

آپ کی زبان صاف اور سیدھی سادی ہے۔ لیکن اس پر بہار کا گہرا اثر ہے۔ تحریر میں طنز کا پہلو غالب ہے۔

۱۲

کرائے کی ٹمٹم

شام کو بانکی پور سے گیا جانے والی ٹرین ٹھیک پانچ اور چھ کے درمیان کھُل جاتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ میں ہر بات میں بہت زیادہ محتاط واقع ہوا ہوں۔ خاص کر ریل کے معاملہ میں۔ کیونکہ اول تو یہ اپنے بس کی سواری نہیں۔ دوسرے ادنیٰ اعلیٰ، بھلے بُرے کی یہاں کوئی تمیز نہیں۔ آپ ہزار معزز اور اعلیٰ پوزیشن کے ہوں مگر دو منٹ بھی دیر ہوئی اور بغیر انتظار کئے روانہ ہو گئی۔ بعض اوقات بڑے بڑے جنٹل مینوں کو پلیٹ فارم پر پہنچ کر اپنے سامنے ریل کھُل جانے کا نظّارہ حسرت اور غصہ کی نظر سے دیکھنا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ ہی کہئے کہ احتیاطًا اگر چار ہی بجے میں نے بستر وغیرہ باندھ چھاندھ کر سڑک تک ٹمٹم پر اسباب لے جانے کے لئے اپنے میزبان بھائی منظر سے آدمی مانگا تو کیا بُرا کیا؟ جو خواہ مخواہ میری اس احتیاطی کارروائی کا تمسخر انگیز مسکراہٹ سے "جلد بازی اور بوکھلاہٹ" کہہ کر مضحکہ اڑایا گیا۔ مگر مجھ جیسا دُھن کا پکّا کب ان باتوں کی پروا کرنے والا تھا۔ خود جھٹ ایک بغل میں بستر اور دوسرے بغل میں چھڑی اور چھتری، داہنے ہاتھ میں لوٹا اور بائیں ہاتھ میں ٹفن کیریر اٹھا، دور سے سلام علیک کہہ، وہاں سے چل دینے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ اپنی

جگہ سے کود کر بھائی منظر نے میرے بغل سے بستر کھینچ لیا اور ایک دو صاحب، جو وہاں موجود تھے، کسی نے ہاتھ سے لوٹا، کسی نے ٹفن کیریر چھینا اور ساتھ ہی منت و سماجت شروع کر دی کہ ناشتہ چائے تیار ہے، اسے چھوڑ کر نہ جانا چاہیے۔ منت و سماجت وغیرہ چنداں قابل توجہ بات نہ تھی لیکن ناشتہ چائے کی استدعا کو ان کی دل شکنی کے خیال سے مسترد کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کرہاً نہیں طوعاً اسے قبول کرنا پڑا۔ ناشتہ چائے سے جلد جلد فرصت کر کے چلنے کو جب آمادہ ہوئے تو انھوں نے نہایت متانت کے ساتھ سمجھانا شروع کیا کہ ڈیڑھ دو گھنٹے قبل پہنچ کر پلیٹ فارم پر فضول وقت گذارنے سے کیا حاصل؟ اگر یوں ہی اسٹیشن پہلے پہنچنے کا شوق ہے تو آدھ گھنٹہ قبل ساڑھے پانچ بجے یہاں سے چلے جایئے گا۔ گھڑی دکھلا کر کہا کہ ابھی ساڑھے چار بجے ہیں، گاڑی چھ بجے غروب آفتاب کے بعد کھلتی ہے۔ میں نے کہا بھائی صاحب! ان گھڑیوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ کبھی تو آفتاب ڈوبنے کے بہت بعد قریب سات کے چھ بجتے ہیں اور کبھی دن رہتے پانچ ہی بجے چھ کا وقت ہو جاتا ہے۔ کیا معلوم کہ آج کس وقت چھ بج جائیں۔ غرض میں نے بھی ایسا قائل اور لاجواب کر دیا کہ سوائے مسکرا کر چپ رہنے کے کوئی جواب اس سے نہ بن سکا۔ میں فاتحانہ انداز سے ملازم کے سر پر اسباب رکھوائے اور سبزی باغ کے نکڑ پر عدالت کے سامنے ٹمٹمستان یعنی ٹمٹم کے اڈے پر پہنچا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی سب یکہ بان یک بیک وقت پروانہ وار ٹوٹ پڑے ـــ اس طرف آیئے سرکار۔ یہ ٹمٹم حاضر ہے۔ اِدھر

تشریف لائیے حضور! آپ کے لیے یہ ٹمٹم موجود ہے۔ چھم دروازہ جائیے گا؟
چوک جائیے گا جناب؟ اس پر آیئے۔ اس پر آیئے۔ اسٹیشن چلیے گا میاں
صاحب؟ فوراً پہنچاتے ہیں۔ غرض جس کو دیکھئے مجھ کو حاصل کرنے کے
لیے بیتاب ہے۔ کوئی اسباب اپنی ٹمٹم پر رکھوانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کوئی
میرا بازو تھامے اپنی طرف کھینچے لیے جا رہا ہے۔ اپنی یہ عزت افزائی اور قدر
دانی دیکھ کر مجھے یہ یقین ہو گیا کہ واقعی آدمی کی قدر اپنے شہر سے باہر ہی ہوتی
ہے۔ یکہ بانوں کے اس اظہار عقیدت سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ کسی کی دل شکنی
کی میری ہمت نہ پڑی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا اسباب دوسری ٹمٹم پر اور میں
بذات خاص دوسری ٹمٹم پر، جس پر دو صاحب اول پہلے سے بیٹھے تھے۔ یکہ بان
نے کہا یہ دونوں بھی چوک ہی جا رہے ہیں۔ آپ وہاں کس جگہ اتریں گے؟
میں نے کہا ارے بھائی! مجھے اسٹیشن پہنچنا ہے۔ ریل کا وقت قریب ہے۔
تجھے چوک ہی جانا ہے تو اسٹیشن ہوتے ہوئے چلے جانا۔ اس نے ہنس کر کہا
کہ اسٹیشن یہاں سے پچھم ایک میل اور چوک لہرا اب دو تین میل ہے۔ بمبئی کے
راستہ سے کلکتہ جانے کو آپ کہہ رہے ہیں؟ مجبوراً اس سے اتر کر دوسری
ٹمٹم پر جس پر نہ معلوم کس طرح اسباب رکھ دیا گیا تھا، سوار ہونے چلا۔ پاس
ہی بغل میں ایک صاحب ٹہل رہے تھے، انھوں نے کہا کہ کہاں آپ ان یکہ بانوں
کے پھیرے میں پڑتے ہیں۔ یہ آپ کو ٹمٹم پر بٹھلا کر گھنٹوں سواریوں کی تلاش میں
ادھر اُدھر ٹہلاتے پھریں گے۔ جب تک چار سواریاں پوری نہ ہو لیں گی،

یہاں سے ٹلیں گے نہیں - مجھے بھی اسٹیشن ہی جانا ہے - تھوڑی دیر اسی جگہ ٹھہریے - جس ٹمٹم پر دو آدمی بیٹھ جائیں، ہم دونوں بھی اس پر سوار ہو جائیں تاکہ زیادہ دیر تک کسی اور ساتھی کا انتظار نہ کرنا پڑے - بات تھی معقول - محض معمولی رد و قدح کے بعد سامان ٹمٹم سے واپس لے کر اس جگہ کھڑا ہو گیا - چند قدم کے فاصلے پر ایک ٹمٹم کو دیکھا جس پر دو شخص بیٹھے تھے - میں اسی تاک میں تھا ہی - فوراً چل کر بیٹھ ہی جانا چاہیئے ورنہ جلد ایسا موقع ہاتھ سے نکل جائیگا - لیکن وہ حضرت کچھ یوں ہی سے تھے - فرمانے لگے - جناب! اس میں تو ایک دم مریل بڈھا گھوڑا جُتا ہوا ہے - ابھی ابھی کوئی اچھی ٹمٹم ملتی ہے - میں نے کہا قبلہ ریل کا وقت قریب ہے - مجھے تو گھوڑا خریدنا نہیں جو اس کے سن و سال، فربہی دلاغری کو دیکھوں - اتنی دور اسٹیشن تک پہنچنے کے لئے بہت کافی سن ہے - بندہ تو اسی پر جاتا ہے - آپ کسی دوسری اچھی سی ٹمٹم پر بعد کو آیئے گا - سب برضد دیکھ کر اخلاقاً وہ بھی ہمارے ساتھ اس ٹمٹم پر بیٹھ رہے - میں نے یکہ بان سے کہا لے اب چل مگر ذرا تیز ہانکنا - ریل کا وقت قریب ہے - یہ جملہ ابھی پورا نہ ہوا تھا کہ دونوں جو پہلے سے اس ٹمٹم پر بیٹھے ہوئے تھے، ٹمٹم سے اتر پڑے اور لگے اِدھر اُدھر ٹہلنے - میں نے یکہ بان سے بگڑ کر کہا کہ یہ کیا مذاق ہے؟ ریل کا وقت قریب ہے، مجھے جانے کی جلدی ہے اور یہ دونوں اطمینان سے چہل قدمی میں مصروف ہیں - یکہ بان نے مسکرا کر کہا کہ جناب خفا نہ ہوں - یہ دونوں اسٹیشن جانے والے مسافر نہیں ہیں، ہمارے ملاقاتی ہیں - تھوڑی دیر

کے لئے ہیں نے اس غرض سے ٹمٹم پر بٹھالیا تھا کہ انھیں دیکھ کر اور مسافر اس پر آجائیں گے۔ آپ گھبرائیں نہیں، ابھی فوراً دو سواریاں بٹھا کر بات کی بات میں اسٹیشن پہنچاتا ہوں۔ یہ کہہ کر اسٹیشن! اسٹیشن پکارتا ہوا لگا ٹمٹم اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چکر دینے۔ بسیوں پھیرے لگائے مگر لاغر اور بڈھا گھوڑا دیکھ کر کوئی اِدھر متوجہ نہیں ہوا۔ کہیں جانے کے لئے جو اس جگہ آیا وہ دوسری ٹمٹم پر سوار ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اگر یہی حالت رہی تو خدا جانے کئی گھنٹے یوں ہی ٹمٹم پر پھیرے لگانے گذر جائیں گے۔ مجبوراً ایکہ بان کے اسی کام میں میں بھی مدد دینے لگا۔ جو سامنے سے گذرا، میں نے خوشامدانہ لہجہ میں مخاطب کر کے کہا۔ کہاں جناب! اسٹیشن جائیے گا؟ اس ٹمٹم پر تشریف لائیے۔ کیوں بھائی صاحب! اسٹیشن کا ارادہ ہے؟ میں بھی تو وہاں جا رہا ہوں۔ آئیے اسی ٹمٹم پر۔ بسیوں راہ چلنے والوں سے اپنے ساتھ ٹمٹم پر بیٹھنے کی درخواست کی۔ مگر اسٹیشن تو کیا، اخلاقاً تھوڑی دور تک بھی کوئی ساتھ دینے کو تیار نہ ہوا۔ صرف مسکراتا ہوا سامنے سے گذر گیا۔

یہ تو ہے ہندوستانیوں کے اخلاق اور ہمدردی کا حال اور اس پر چلے ہیں سوراج لینے! عاجز آکر جی چاہا کہ اپنا اسباب لئے دیئے کود کر جھٹ کسی دوسری ٹمٹم پر سوار ہو جاؤں۔ اسی تہیہ میں تھا کہ ایک پنڈت جی نے قریب آکر پوچھا کہ آپ لوگ اسٹیشن جا رہے ہیں؟ یہ سننا تھا کہ "آئیے پنڈت جی تشریف لائیے مہاراج" کہتے ہوئے ہاتھ کا سہارا دے کر فوراً اپنی ٹمٹم پر کھینچ لیا۔

اب باقی رہا ایک ساتھی اور۔ تو دل میں سوچا کہ جس خدا نے میری مصیبتوں کو کم کرنے کے لئے بے شان وگمان ایک پنڈت جی کو بھیج دیا۔ اس کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ اسی طرح کوئی خدا کا بندہ ایک اور پھنس جائے۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک شخص صاف ستھری دھوتی قمیص پہنے، سر پر لکھنؤ کی قیمتی بیل کی ٹوپی رکھے اور بغل میں دُھلے ہوئے کپڑوں کی گٹھری لئے ٹمٹم پر آکر بیٹھ گیا اور کہا کہ اسٹیشن سے اسی طرف مسٹر لونس صاحب کی کوٹھی کے پاس اتار دینا۔ میں نے یکہ بان سے کہا۔ اب تو چار سواریاں پوری ہوگئیں۔ خدا کے لئے جلد ہانک۔ ریل کا وقت قریب ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ٹرین چھوٹ جائے " سرکار! ابھی بات کی بات میں پہنچاتا ہوں " یہ کہتے ہوئے اس نے ایک قمچی، جس میں ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ کی رسّی بندھی تھی، آہستہ سے گھوڑے کی دُم پر لگائی اور چمکار کر کہا چل پٹھے اسٹیشن ہی پہنچ کر دم لینا۔ مگر گھوڑے نے کچھ سُنا ہی نہیں۔ اس کی اس بے پروائی کو دیکھ کر ایک قمچی رسید کرنے کے ساتھ ہی لگام کو زوروں سے جھٹکا دے کر یکہ بان نے کہا۔ بیٹا! دکھا تو دے ذرا ریس کا مزہ۔ مگر اس ناخلف بیٹے نے اس پر بھی کوئی دھیان نہ دیا۔ صرف دُم ہلا کر اور کان پھٹپھٹا کر رہ گیا۔ اب یکّہ بان کو تاب کہاں۔ متواتر پانچ چھ قمچیاں سٹاک سٹاک زوروں سے لگا کر کہا۔ سالا چلتا ہے یا نہیں؟ میں نے سمجھا کہ بیٹا سے جو سالا بنایا گیا ممکن ہے کہ اس تبدیلِ رشتہ کا کچھ اچھا اثر پڑے۔ مگر وہ سالا بیٹا آگے بڑھنے کے عوض اور پیچھے کی طرف ہٹنے لگا۔

میں نے یکّہ بان سے کہا کہ اگر گھوڑا اُلٹا چلنے کا عادی ہے تو خدا کے لئے اسٹیشن کی جانب سے اس کا رُخ پھیر کر پورب کی طرف کر دے۔ اسی طرح پیچھے ہٹتا ہٹتا شاید اسٹیشن پہنچ جائے۔ اس نے کہا۔ حضور بات اصل یہ ہے کہ اس کے دانے کا وقت قریب آگیا ہے اس لئے اپنے گھر کی طرف جانے کے لئے اَڑ رہا ہے۔ ابھی اسے میں درست کئے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر قمچی بازی شروع کر دی۔ مگر گھوڑا بھی عجیب جی دار اور ثابت قدم نکلا۔ اُدھر پیٹھ پر سٹاک سے پڑی اِدھر اُس نے جواب میں یکّہ کے پائدان پر جسے ان کی اصطلاح میں اڑنی کہتے ہیں' تڑاق سے دو لتّی جھاڑ دی۔ یکّہ بان کے چابک اور گھوڑے کی اڑنی پر دولتّیاں جھاڑنے کی یکے بعد دیگرے سٹاک اور تڑاق کی آوازیں دیر تک ہم لوگوں کی سمع نوازی کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ یکّہ بان کا ہاتھ اور گھوڑے کے پاؤں نے تھک کر تھوڑی دیر کے لئے خود بخود مہلت لے لی۔ یہ حالت دیکھ کر ہم چاروں ٹمٹم کے سیٹنگ ممبروں نے واک آؤٹ کا متفقہ فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے پنڈت جی نے پیش قدمی کرنی چاہی۔ اسی ارادے سے پاؤں لٹکا کر کودنا چاہتے تھے کہ یکّہ بان نے جھٹ ان کی ٹانگیں تھام اور کہا کہ اگر اس ٹمٹم پر نہ جانا تھا تو آکر بیٹھتے ہی نہیں۔ گھوڑے کو اس قدر پٹوا کر اب چلے دوسری ٹمٹم پر۔ یہ تو اب نہیں ہو سکتا۔ میں نے بگڑ کر کہا۔ ریل کا وقت قریب ہے۔ اس مریل گھوڑے کے پیچھے کیا اپنی ٹرین چھوڑ دوں؟ اس نے کہا۔ میاں صاحب! یہ ذرا بیماری کی وجہ سے دُبلا اور کمزور ہو گیا ہے۔

فرمانے لگے کہ اچھوت دھوبی ہو کر برہمن کے ساتھ برابر بیٹھنے کی تجھے کیسے ہمت پڑی؟ ہمارا شہر ہوتا تو اس شوخی کا مزہ چکھا دیتے اور پھر ہم لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ آپ لوگوں کو اختیار ہے۔ چمار دھوبی جس کو چاہیں ساتھ بٹھلائیں۔ میں شدروں کے ساتھ اپنے کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا۔ میں دوسری ٹمٹم پر چلا جاتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ یہ پھنسا ہوا شکار اگر ہاتھ سے نکل گیا تو پھر دوسرے ساتھی کے پھانسنے میں خدا جانے اور کتنی دیر لگے گی اور ریل کا وقت قریب ہے۔ میں پنڈت جی کی خوشامدیں کرنے لگا کہ مہاراج جب اسے چھو چکے تو گھر جا کر نہا دھو کر پاک ہو جایئے گا۔ اس وقت تو ہم لوگوں کو نہ چھوڑیے۔ اس کے علاوہ اچھوتوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ اگر گاندھی جی کو معلوم ہو گیا تو برت رکھ رکھ کر ناک میں دم کر دیں گے اور جو کہیں ڈاکٹر امبیدکر کو خبر لگ گئی تو آپ جانیئے کی شدروں کا یہ گروگھنٹال کونسل کے علاوہ ہر جگہ میں بھی ریزروسیٹ پر اڑ جائے گا۔ ایسے نازک وقت میں جب گاندھی جی نے ڈاکٹر صاحب کے مطالبہ کو خوب تھاپ کر دبا دیا ہے تو آپ کا بر سر سڑک چھوت چھات کے قضیّے کو چھیڑنا کسی طرح مناسب نہیں۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ یہ برہمن لون برہمن کا جھگڑا چلتی گاڑی یا رکی ہوئی ٹمٹم کے لئے روڑا بن جائیگا۔ بارے خدا خدا کر کے ہماری منت و سماجت پر وقتی مصلحت سے پنڈت جی راضی ہو گئے۔ قریب دس منٹ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب تک کہ یکّہ بان اور گھوڑا پھر تازہ دم ہو گئے۔ اب جو پھر اس نے لگام کھینچ کر چھمچی چلائی تو

ورنہ ایسا جیوٹ کا گھوڑا ڈھونڈھے نہیں ملے گا۔ دیکھا نہیں! ایسا کس کس کے بیسوں چابک پڑے مگر سوائے دولتیاں جھاڑنے کے چوں تک نہیں کی۔ میں نے کہا۔ مگر ایسا ثابت قدم گھوڑا تو نون وائلنس والنٹیروں کی سواری کے لائق ہونا چاہیئے جو ڈنڈے اور ہنٹر کھا کر بھی قدم نہیں اٹھاتا۔ اس ٹٹم میں جوت کر خواہ مخواہ ایسے بہادر گھوڑے کی تم نے مٹی پلید کی۔ اس نے ہنس کر کہا کہ سرکار میں جھوٹ نہیں کہتا۔ آج ہی صبح جو یہاں سے بجلی کی طرح چلا تو پھلواری ہی جا کر دم لیا۔ اس کی تیزی کا حال دیکھنا ہو تو گھوڑ دوڑ کے میدان میں چھوڑ دیجئے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ریس کے گھوڑوں سے میری ٹمٹم آگے ہی نظر آئے گی۔ صرف یہی ذرا عیب ہے کہ چلا تو چلا اور اڑا تو اڑا۔ پنڈت جی نے بگڑ کر کہا کہ اس بڈھے گھوڑے کے بدن پر ماس تو ہے نہیں، پسلی کی ہڈی تک نظر آ رہی ہے اور جھوٹ موٹ تعریف کئے جا رہا ہے۔ سفید پوش سا ئقی نے پنڈت جی کے ہاں میں ہاں ملائی اور کہا کہ اس سے کہیں اچھا تو ہمارا گدھا ہے۔ پنڈت جی نے گھور کر دیکھا اور گھور کر پوچھا کہ تمہارے پاس گدھا کس لئے ہے؟ اس نے کہا۔ گھاٹ پر کپڑا لے جانے اور وہاں سے لانے کے لئے ہم لوگ گدھا ہی رکھتے ہیں۔ پنڈت جی نے اپنا دامن سنبھالتے ہوئے ذرا کھسک کر پوچھا کہ تم دھوبی ہو؟ اس نے کہا۔ جی ہاں! مگر اور دھوبیوں کی طرح معمولی نہیں۔ میں اشراف دھوبی ہوں۔ حاکموں اور بیرسٹروں کا کپڑا دھوتا ہوں۔ اتنا سننا تھا کہ پنڈت جی آپے سے باہر ہو گئے۔ غصہ میں

بجائے آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے کے گردن موڑ کر اپنے گھر کی طرف رُخ کرنا چاہا۔ یہ دیکھ کر پنڈت جی بے ساختہ بول اٹھے کہ گھوڑے کا قصور نہیں بلکہ یہ یکّہ بان ہی اناڑی معلوم ہوتا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ آگیا یکّہ بان کو تاؤ۔ پوری طاقت سے باگ کھینچ کر گھوڑے کا رُخ سیدھا کیا اور قمچی رکھ کر پنڈت جی کا ڈنڈا لے دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر گھوڑے کی پیٹھ پر پانچ سات کس کر اس زور سے جمایا کہ اَڑنے اور شرارت کرنے کی بجائے ٹمٹم کو لئے دیئے چھلانگیں مارتا ہوا اس طرح بھاگا کہ اب ہم لوگ روکنا، تھامنا، لاکھ چلّا رہے ہیں مگر وہ "اَڑا تو اَڑا اور چلا تو چلا" والا مضمون شاید غلط نہیں تھا۔ اس وقت گھوڑا "چلا تو چلا" کے عالم میں تھا۔ مجبوراً ٹمٹم کا کنارا مضبوط سے پکڑے ہوئے دل میں دعا کرتا جا رہا تھا کہ اللہ العالمین اگر ٹمٹم سے گرنا ہی قسمت میں لکھا ہے تو کم سے کم شہر سے باہر لوَن کے میدان کے قریب عزت و آبرو کے ساتھ گرانا۔ یہ بانکی پور کی بیچ سڑک پر ٹمٹم اُلٹ جانے سے اپنے زخمی ہونے کا اتنا خیال نہیں جتنا راہ گیروں کی بھیڑ اور دکانداروں کے تمسخر انگیز ہمدردانہ جملے۔ ابھی نہ گر جاتے، واہ بھئی خوب سنبھل کر گرے، خیریت ہوئی کہ آنکھ ناک بچ گئی، کوئی پرواہ نہیں، گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔ بہ نمک بر جراحت سے کم نہیں۔ گھوڑا جس بدحواسی کے عالم میں ٹمٹم کو گھسیٹے اور اٹھا پٹک کرتا ہوا جا رہا تھا، مجھے یقین ہو گیا کہ ٹمٹم پر اسٹیشن پہنچنے کے عوض کھٹولی پر ہسپتال جانا پڑے گا۔ لیکن خدا جانے کیا ہوا کہ تھوڑی دور جا کر اچانک خود بخود گھوڑا اس طرح

کھڑا ہو گیا کہ گویا ٹمٹم کے شوفر نے یکایک بریک کس دیا ہو۔ ساتھ ہی پٹرول کے بہنے کی سی آواز کانوں میں آنے لگی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گھوڑے صاحب دفعہ ۳۴ کی خلاف ورزی میں مصروف ہیں یعنی بیچ سڑک پر استنجا فرما رہے ہیں۔ میں نے یکّہ بان سے کہا کہ دیکھو دوست ریل کا وقت قریب ہے۔ اس نے برجستہ کہا کہ ابھی بات کی بات میں پہنچاتا ہوں۔ گھوڑا ادھر حوائج ضروری سے فارغ ہوا اور اُدھر یکّہ بان نے لگام کھینچ کر قمچی چلائی۔ مگر "چلا تو چلا" ختم ہونے کے بعد اب شاید "اڑا تو اڑا" کا وقت تھا۔ اس لئے ٹمٹم سے فوراً اتر کر یکّہ بان نے اس کے تھوتھنے کے پاس لگام پکڑ کر آگے کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ لیکن بجائے اس کے کہ گھوڑے کو آگے بڑھائے، اس کے اڑنے میں وہ خود اس کے ساتھ تھوڑی دور تک کھنچا چلا گیا۔ اِدھر یکّہ بان لگام کا رسّا تھامے اپنی طرف زور لگا رہا تھا، اُدھر گھوڑا گردن ٹیڑھی اور اونچی کئے اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔ اس ٹگ آف وار کی کشمکش میں گھوڑے کو شرارت سوجھی تو یکایک اُلف کھا کر پچھلے دونوں پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ لگام تھامے رہنے کی وجہ سے یکّہ بان صاحب زمین سے مائل بہ بلندی ہو چلے تھے کہ ہاتھ سے باگ چھوڑ دی۔ ورنہ سڑک کے ایک نئے تماشے کا لطف آ جاتا۔ اب اس کے بعد بھی ایسی ٹمٹم پر بیٹھے ا[illegible] کو ہم لوگوں کی ہمّت و جرأت یا حماقت آپ جو چاہیں سمجھیں لیکن آپ [illegible] مانیں کہ کوئی دقیقہ اس ٹمٹم سے جان چھڑانے کا اُٹھا نہیں رکھا گیا۔ مگر [illegible] ہاں

"کمبل ہی نہیں چھوڑتی" کا قصہ تھا۔ میں نے یکہ بان سے لاکھ کہا کہ ریل کا وقت قریب ہے۔ اپنا کرایہ لے لے اور ہم لوگوں کی جان بخش۔ جواب سُنیے۔ نہیں صاحب! میں مفت خوار نہیں کہ بغیر اسٹیشن پہنچائے حرام کا پیسہ لے لوں۔ آج اگر درمیان میں راستہ میں آپ کو اُتار کر کرایہ وصول کر لوں تو کل کون مسافر میری ٹمٹم پر سوار ہوگا؟

پنڈت جی اس کی باتوں کی پروا نہیں کر کے ٹمٹم سے اترنے کی کوشش کرنے لگے تو اس نے بگڑ کر کہا کہ دیکھیے مہاراج! آپ کے کودنے سے گھوڑا اگر بھڑکا تو آپ جانیے۔ مجبوراً ڈر سے بے چارے نے اپنا پاؤں اوپر سمیٹ لیا۔ یکہ بان ہم لوگوں کی دل جوئی کے خیال سے کہنے لگا کہ بس اسکے اُڑان میں اسٹیشن ہی پہنچے گا۔ اگر اب اس نے شرارت کی تو میں خود دوسری ٹمٹم پر آپ لوگوں کو سوار کرا کر اسٹیشن پہنچا دوں گا۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ بیچ راستہ میں آپ سب کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ یہ کہتے ہوئے ٹمٹم سے اُتر کر گھوڑے کی گردن پر تھاپ مار کر چمکارا اور لگام پکڑ کر آگے کی طرف بڑھاتے ہوئے ہم لوگوں سے کہا کہ ذرا آہستہ سے چابک لگا دیجئے۔ پنڈت جی جو سب کے آگے بیٹھے تھے، انھوں نے چابک کے بدلے اپنے ڈنڈے سے خدا جانے کہاں کھونچا لگا دیا کہ یکایک دولتیاں جھاڑتا ہوا جس رفتار اور جس شان سے چلا ہے وہ حضرت اکبرؔ کے آب لڈوا کی روانی سے کم نہیں ؎

بدکتا ہوا اور بھڑکتا ہوا   چمکتا ہوا اور بدکتا ہوا

اچکتا ہوا اور اچھلتا ہوا ۔۔۔ وہ کھا کھا کے ٹھوکر سنبھلتا ہوا
اِدھر اور اُدھر وہ بہکتا ہوا ۔۔۔ وہ ٹمٹم اٹھاتا پٹکتا ہوا
لگام اک طرف وہ چباتا ہوا ۔۔۔ اِدھر رال مُنہ سے گراتا ہوا
وہ ہچکولے سب کو کھلاتا ہوا ۔۔۔ وہ ٹمٹم کو جھولے جُھلاتا ہوا
وہ چابک کی ہیبت سے ڈرتا ہوا ۔۔۔ اٹھا کر وہ دُم لید کرتا ہوا

غرض اسی شان سے وہ ٹمٹم سینما کے کچھ ہی آگے پہنچی تھی کہ یکایک یکّہ بان نے لگام زوروں کے ساتھ کھینچ کر گھوڑے کو روکا اور کہا کہ حضور غضب ہو گیا۔ ہم لوگوں نے متفقہ وحشت کے ساتھ پوچھا۔ ارے کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟ اس نے خوفزدہ انداز میں کہا کہ دیکھئے وہ قصائی سامنے کھڑا ہے۔ آج نہیں چھوڑے گا۔ میں نے کہا خدا کے لئے جلدی بتا کہ تجھ کو یا تیرے گھوڑے کو قصائی سے کیا سروکار؟ اس نے کہا حضور! یہ گھوڑے کا ڈاکٹر ہم لوگوں کے لئے قصائی سے کم نہیں۔ اس کے ظلم سے ٹمٹم والے پریشان ہیں۔ کسی گھوڑے کو معمولی سا زخم ہوا یا پیٹھ داغی ہوئی اور اس نے رپورٹ کر کے جرمانہ ٹھکوا دیا۔ میرا گھوڑا کئی روز سے ذرا بیمار ہے اور پیٹھ پر معمولی سا زخم بھی ہے۔ پرسوں جو اس نے پکڑا تو منت وسماجت کے بعد اس شرط پر چھوڑا کہ جب تک یہ ایک دم تندرست نہ ہو جائے یہ ٹمٹم میں نہ جوتا جائے۔ آپ ہی انصاف کیجئے کہ ہم جیسے مزدوری پیشہ والے گھوڑا کو بٹھا کر کہاں سے کھلا سکتے ہیں۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سامنے ایک کانسٹیبل غالباً اسی

ٹمٹم کی پیش قدمی کے لئے آتا دکھائی دیا۔ وہ لے بر ندش ٹمٹم ڈاکٹر صاحب کے سامنے پہنچی۔ نظر پڑتے ہی ڈاکٹر صاحب نے ڈپٹ کر سپاہی کو حکم دیا کہ ان سب کو اُتار کر گھوڑا کھولو اور اسپتال پہنچا دو۔ پنڈت جی نے خدا جانے کیا سمجھا کہ لگے ڈاکٹر صاحب سے خوشامدانہ لہجے میں آرزو کرنے کہ ڈاکٹر صاحب! اول تو ہم بیمار نہیں، اگر آپ کے دانستہ کوئی بیماری ہو تو بھی مجھے یہاں کے اسپتال میں کیوں بھیجتے ہیں؟ ہمارے شہر میں خود اسپتال ہے، وہیں میں علاج کر لوں گا۔

ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا کہ آپ بھی عجیب جانور قسم کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے گھوڑے کو اسپتال بھیجنے کے لئے کہا یا آپ کو؟ ان کے تبسّم پر ہماری بھی ہمت بڑھی۔ میں نے کہا جناب ڈاکٹر صاحب! ریل کا وقت قریب ہے۔ خدا کے لئے میری حالت پر رحم کیجئے اور صرف اسٹیشن پہنچانے کی اجازت دیجئے۔ اس کے بعد آپ اسپتال میں اسے بھیجئے، یا پوسٹ مارٹم روم میں۔ مجھے کوئی عذر نہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ یکّہ بان بے زبان جانوروں پر اس قدر ظلم کرتے ہیں کہ بعض اوقات دیکھ کر میرا قلب شق ہو جاتا ہے — شقی القلب جو یکّہ بانوں نے ان کا لقب دے رکھا تھا، اس کی وجہ اس وقت سمجھ میں آئی۔ آخر بہ ہزار خوشامد اسٹیشن تک پہنچانے کی انھوں نے اجازت دی اور سپاہی کو بلا کر کہا کہ تم اسٹیشن تک ساتھ جاؤ۔ وہیں سے گھوڑا کھول کر اسپتال

پہنچا دینا۔ ان کی اس مسافر نوازی پر بے ساختہ بھری زبان سے دعا نکلی کہ خدا آپ کو ترقی دے کر ہاکی کا سول سرجن بنائے۔ ڈاکٹر کا حکم پاتے ہی ایک تو ند مند سپاہی صاحب ہاتھ میں ایک لانبی لاٹھی لئے سب سے آگے ٹمٹم پر آ کر بیٹھ گئے۔ اس لئے یکہ بان کو مجبوراً گھوڑے کی باگ ہاتھ میں لئے ساتھ ساتھ پیدل چلنا پڑا۔ میں نے سمجھا تھا کہ اب یہاں بھی "اڑا تو اڑا" والا مضمون دُہرایا جائے گا۔ مگر نہ معلوم پولیس کے خوف سے یا سپاہی کے بھاری بوجھ سے جلد چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بلا عذر دُم دبائے ہوئے گردن نیچے کئے خاموشی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوا۔ ابھی چند ہی قدم گھوڑا چلا تھا کہ یکہ بان نے کہا کہ آگے کی طرف دباؤ زیادہ ہے، ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھئے۔ پہلے سے ہم چاروں ٹمٹم کے سابق سیٹنگ نمبر جہاں جہاں بیٹھے تھے، سپاہی جی کی سرکاری سیٹ کے باعث ہم سب کا پوزیشن گڑبڑا گیا۔ پنڈت جی جو آگے صدر کی حیثیت سے بیٹھے تھے، ان کو سرکاری مداخلت کے باعث اچھوت دھوبی کے اپوزٹ سائڈ میں جا کر بیٹھنا پڑا اور اب نشست یوں رہی کہ ایک طرف ہمارے پہلے ساتھی اور پنڈت جی، دوسری جانب کپڑے کی گٹھری لئے وہی اشراف قسم کے دھوبی اور آگے یکہ بان کی جگہ پر دھپ کی حیثیت سے سپاہی صاحب اور بیچ میں یہ خاکسار، ناچیز، ہیچمدان وغیرہ۔ اب دباؤ کے خیال سے یکہ بان نے پیچھے ہٹنے کو کہا تو سپاہی کا سرکاری آدمی ہو کر کیوں اپنی جگہ سے ہٹنے لگا اور بقیہ تینوں صاحب

پچھلی جانب بیٹھے ہی تھے۔ مجھے مجبوراً کھسکنا پڑا۔ اپنی جگہ سے ہٹنا تھا کہ یکہ بان نے آواز دی کہ پیچھے کی جانب بوجھ زیادہ ہو گیا، ذرا آگے بڑھ جائیے۔ وہاں سے اُچک کر آگے بڑھ آیا۔ اب ارشاد ہوا۔ اتنا آگے نہیں، تھوڑا اور پیچھے ہٹئے۔ مگر پنڈت جی کی طرف نہیں، ورنہ اُلار ہونے کا خوف ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ آگے بڑھئے تو دباؤ۔ پیچھے ہٹئے تو اُلار۔ ٹمٹم مدھم رفتار سے جا رہی تھی اور میں کبھی اِدھر کبھی اُدھر، کبھی آگے کبھی پیچھے، اپنی جگہ بدل بدل کر بیلنس درست کرتا جا رہا تھا۔ میرا پوزیشن اس وقت ٹھیک مولانا شوکت علی کی طرح ہو گیا تھا۔ کبھی اچھوت کے پاس پہنچا، کبھی سپاہی جی یعنی سرکاری آدمی کی طرف بڑھا، کبھی پنڈت جی کے پاس کھسک گیا۔ غرض جس طرف جھکا وزن بھاری ہو گیا۔ ہم نے لاکھ کوشش کی کہ کہیں ایسی جگہ ہٹ جاؤں کہ یہ دباؤ اور اُلار کا قصّہ ہی ختم ہو۔ مگر میں ٹھرے کی طرح اِدھر اُدھر لڑھکتا ہی رہا۔ راستے میں چند آزاد منش منچلے لونڈے اُدھر سے آ رہے تھے۔ کانسٹبل کی نگرانی میں ہم سب کو جاتے دیکھ کر دوسرے نے آواز کسا کہ "عورت تو بھلے آدمیوں کی سی ہے۔" تیسرے نے قہقہہ لگا کر کہا "اخاہ ایک پنڈت جی بھی ہیں۔" چوتھے نے گہر افشانی کی "جا نزاد دیکھ کر چلے ہوں گے اس لیے پکڑے گئے۔" پانچویں نے بیڑی کا دھواں منہ سے نکالتے ہوئے کہا —— "ارے یار اسباب جو برآمد ہوا وہ بھی ساتھ ہے۔" اتفاق کی بات کہ جیل بھی اسٹیشن کے قریب ہی واقع ہوا تھا۔ اب کون سب کو سمجھائے کہ

نہیں بھائی سپاہی نے نہیں بلکہ یکّہ بان نے بے قصور ہم لوگوں پکڑ لیا ہے۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ ٹمٹم آگے بڑھ گئی ورنہ اور کیا کیا اپنے متعلق قیاس آرائیاں سُننے میں آتیں۔ غصہ میں تو جی چاہا کہ ڈیفیمیشن (توہین) کا سانحہ سپاہی جی کی معرفت لکھا دوں لیکن چونکہ ریل کا وقت قریب تھا اس لئے ان باتوں کا زیادہ خیال نہیں کیا۔ آخر خدا خدا کر کے اسٹیشن پہنچا۔ فوراً قلی کو بلا کر پوچھا کہ گیا والی ٹرین جا چکی یا نہیں۔ اس نے کہا بس کھُلنے ہی کو ہے، جلد چلیے ورنہ ٹرین پھر نہیں ملے گی۔ جھٹ ٹمٹم سے کود قلی کے سر پر اسباب رکھوا سیدھا اس پار پلیٹ فارم کا رُخ کیا۔ پُل پر جانے کے لئے سیڑھی پر جیوں ہی قدم رکھا تھا کہ کسی نے زور سے دامن کھینچا۔ مُڑ کر دیکھتا ہوں تو یکّہ بان کہہ رہا ہے کہ واہ میاں واہ کرایہ دیئے بغیر بھاگے جا رہے ہیں؟ جیب میں ہاتھ دے کر دیکھا تو سوائے نوٹ اور روپے کے خردہ ایک پیسہ نہیں۔ میں نے کہا ریل کا وقت قریب ہے۔ روپیہ بھُنا کر دینے کا موقع نہیں۔ اگلے آکر سود در سود جوڑ کر کرایہ لے لینا۔ مگر وہ کاہے کو ماننے والا تھا۔ اِدھر قلی اسباب لے کر آگے بڑھ چکا تھا۔ وہیں سے اس نے پکارا کہ جلدی آئیے، ریل چھوٹ رہی ہے۔ اِدھر یکّہ بان چمٹا ہوا جان چھوڑنے کو تیار نہیں۔ غصہ میں میں نے جیب سے روپیہ نکال کر کہا۔ تیرے پاس خردہ ہے تو اپنا کرایہ لے کر بقیہ واپس کر۔ اس نے اپنے بٹوے سے ریزگاری گِنا تو صرف سات آنے پیسے نکلے۔

اب میں بقیہ پیسہ وصول کرنے کی فکر کرتا یا ریل کو دیکھتا - مجبوراً سات آنے پیسے لے کر کہا جا! بانی تجھے انعام دیا - فوراً خیال آیا کہ اس قدر پریشان کرنے کے بعد میں انعام دے کر مفت پیسے برباد کرتا ہے - اس لئے خیرات کی مد میں دینے کی نیت کر لی - بکہ بان سے پیچھا چھڑا کر ہانپتا کانپتا پُل پر پہنچا - دیکھا کہ انجن جُتا ہوا جانے کے لئے تابڑ تائیں کر رہا ہے - تیز تیز قدم اٹھائے ایک کی جگہ دو دو تین تین سیڑھیوں کو پھاندتا ہوا بدحواس پلیٹ فارم پر جوں ہی پہنچا کہ گارڈ نے جھنڈی ہلا کر سیٹی بجائی - آگے بڑھ کر کسی دوسرے ڈبے میں جا کر اطمینان سے بیٹھنے کا موقع کہاں تھا - اسی بوکھلاہٹ میں سیڑھی کے بغل ہی میں جو قریب تر ڈبہ تھا گھس گیا - وہاں داخل ہوتے ہی "زنانہ زنانہ" کا ایسا شور مچا کہ سامنے سے پولیس کے آنے کے قبل ہی وہاں سے نکل کر دوسرے ڈبہ کی طرف دوڑا - عورتیں واقعی ناقص العقل ہوتی ہیں - اس اتحاد و اختلاط کے زمانہ میں زنانہ مردانہ کا فرق و امتیاز سوال اٹھانا مجھے سخت ناگوار ہوا - لیکن ریل کا وقت قریب ہی تھا، اس لئے غصہ یا افسوس کے اظہار کا موقع ہی نہ ملا - قلی نے پکار کر کہا کہ جلدی بتلائیے، اسباب کس خانہ میں رکھوں؟ ٹکٹ کس درجہ کا ہے؟ ٹکٹ کا لفظ سُن کر خیال آیا کہ لاحول ولاقوۃ - بوکھلاہٹ میں ٹکٹ لینا ہی بھول گیا - لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ اگر بوکھلاہٹ بھی نہ ہوتی تو اتنے تنگ وقت میں اس کا موقع بھی کہاں تھا؟ میں نے قلی کو کہا - جہاں جی چاہے

اسباب رکھ دے۔ دل میں سوچا کہ پروا کی بات نہیں۔ گیا اسٹیشن کے
ماسٹر صاحب طلافانی ہیں۔ گیٹ پر کون روکے گا؟ تھرڈ، سکنڈ، فرسٹ
جس کلاس میں بیٹھ جاؤں گا، پاس ہو جاؤں گا۔ یہ سوچ کر سوار ہونے کے
لئے ایک ڈبہ کی طرف لپکا جا رہا تھا کہ انجن نے سیٹی دی اور گاڑی آہستہ آہستہ
چلنے لگی۔ دوڑ کر چاہا کہ چلتی ٹرین پر چڑھ جاؤں کہ ادھر سے ہاتھ میں سبز
جھنڈی، دانت میں سیٹی دبائے خراماں خراماں گارڈ صاحب آ رہے تھے۔
انھوں نے فوراً ہمارا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ کس درجہ کا ٹکٹ ہے؟ چلتی گاڑی
میں چڑھنے کا حکم نہیں۔ میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا کہ گارڈ صاحب!
خدا آپ کو ترقی دے کر میں کا بلکہ لاٹ صاحب کا اسپیشل گارڈ یا باڈی
گارڈ بنا دے۔ مجھے کسی طرح اس گاڑی میں بٹھلا دیجئے اور نہیں تو کم سے کم
پارسل ہی والے ڈبہ میں اس کمترین کو رکھ دیجئے۔ گیا میں مجھے تول کر جو
واجب محصول ہوگا، لے لیجئے گا۔ مگر اس نے کوئی توجہ نہیں کی۔ ہنستا ہوا کھڑا
دیکھتا رہا۔ اس ٹرین میں جانے والوں میں بعض جانے پہچانے صاحبوں نے
کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا کہ کیا آپ چھوٹ گئے؟ میں نے نہایت متانت
سے کہا کہ میں نہیں، ٹرین چھوٹ گئی۔ ایک صاحب گذرتے ہی گاڑی میں سے
چلّا کر بولے کہ آپ کب تک آئیے گا؟ کچھ کہنا ہو تو فرمائیے۔ آپ کے یہاں
جا کر کہہ دوں گا۔ میں نے بلند آواز سے کہا کہ سب سے کہہ دیجئے گا کہ خیر و
عافیت سے اسٹیشن تک پہنچ گیا۔ اب و دانہ رہا تو انشاء اللہ عنقریب میں...

پہنچتا ہوں۔ یہ گفتگو پوری بھی ہونے نہ پائی تھی کہ گارڈ صاحب کو آخری ڈبہ
پر چڑھنے کے لئے لپک کر جاتے دیکھا۔ میں نے چاہا کہ بڑھ کر ان کی ٹانگ
کھینچ لوں اور کہوں کہ چلتی گاڑی میں چڑھنے کا حکم نہیں۔ مگر جب تک وہ
پاؤدان پر پاؤں رکھ کر اپنے ڈبہ میں داخل۔

میری نگاہوں کے سامنے پلیٹ فارم سے گذرتی ہوئی ٹرین،
دماغ میں کرایہ کی ٹمٹم، زبان پر یہ شعر تھا ؎

حسرت پہ اس مسافرِ بےکس کے رودیئے
گاڑی کھلی ہو جس کی نگاہوں کے سامنے

فرحت

فرحت اللہ بیگ نام ۱۸۸۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں بی۔ اے کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد میں ملازم ہوئے اور ترقی کر کے سیشن جج ہو گئے۔

اعلیٰ درجے کے مزاحیہ نگار تھے۔ آپ کے مزاح میں عمومیت ہوتی ہے۔ ہر بات کو بلا تکلف ہنسی ہنسی میں کہہ جاتے ہیں۔ تحریر میں روانی اور بے ساختگی ہے۔

۱۹۴۷ء میں حیدرآباد میں رحلت فرمائی۔

۱۴

"مردہ بدستِ زندہ"

زمانہ نے خلوص دلوں سے مٹا دیا ہے۔ سچی محبت کی جگہ ظاہرداری نے لے لی ہے۔ نہ اب جیتے جی کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دنیاداری ہی میں دنیاداری رہ گئی ہے۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا گویا اپنا عزیز مر گیا ہے۔ اب کوئی اپنا بھی مر جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مر گیا۔ جنازہ کے ساتھ جانا اب رسماً رہ گیا ہے۔ صرف اس لئے چلے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ واہ جیتے جی دوستی و محبت کا یہ دم بھرا جاتا تھا مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ دیکھا کہ کون مر گیا۔ اب رہی دل کی حالت تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے آیئے میرے ساتھ آیئے آج کل کی میتوں کا رنگ بھی دکھا دوں۔

یہ لیجئے سامنے ہی کے مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔

کوئی بڑے شخص ہیں۔ سیکڑوں آدمی جمع ہیں۔ موٹریں بھی ہیں گاڑیاں بھی ہیں۔ .... غریب بھی ہیں۔ امیر بھی ہیں۔ بیچارے غریب تو اندر جا بیٹھے ہیں۔ کچھ پڑھ بھی رہے ہیں۔ جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھے ہیں یا دروازہ پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں جو غریب آتا وہ سلام کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔ جو امیر آتا ہے وہ اِن باہر والوں ہی میں مل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہلا سوال یہی ہوتا ہے "کیا مر گئے بھئی ہمارے تو بڑے دوست تھے" اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی۔ لیجئے تعزیت ختم ہوئی اور رنج دلی کا اظہار ہو چکا۔ اب دنیا بھر کے قصے چھڑے۔ ایک دوسرے سے نہ ملنے کی شکایت ہوئی، دفتر کی کارروائیاں دریافت کی گئیں۔ ملک کی خبروں پر رائے زنی ہوئی۔ غرض اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ کھینچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا۔

یہ دیکھتے ہی دروازہ کی بھیڑ چھنٹ گئی۔ کچھ اِدھر ہو گئے اور کچھ اُدھر۔ آگے آگے جنازہ ہے اسکے پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں۔ ابھی چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ ان ساتھ والوں میں تقسیم ہونی شروع ہوئی اور چپ چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہوئی اور کیونکر ہوئی۔ جن کو پیچھے رہنا تھا انھوں نے چال آہستہ کر دی جنھیں ساتھ جانا تھا وہ ذرا تیز چلے۔ غرض ہوتے ہوتے یہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے۔ آگے تو وہ رہے جو مرنے والے کے عزیز تھے یا جن کو جنازہ اٹھانے کی اجرت

پر بلایا گیا تھا۔ اس کے پیچھے وہ لوگ رہے جن کے پاس سواریاں نہ تھیں یا شرما شرمی پیدل ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔ اخیر وہ طبقہ ہوا جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہٹتا اپنی سواریوں تک پہونچ گیا اور ان میں سوار ہو گیا۔ اگر پیدل چلنے والوں میں کوئی عہدہ دار ہیں تو غرض مندوں سے ان کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ایک آیا جھک کر سلام کیا۔ گھر بھر کی مزاج پرسی کی۔ مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کئے۔ اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹر کی برائیاں، اگر حکیم کے علاج سے مرا ہے تو طبابت کی خرابیاں ظاہر کیں اور اسی سلسلے میں اپنے واقعات بھی بیان کر گئے۔ اس سے پیچھا چھٹا کہ دوسرے صاحب آ گئے۔ اور انھوں نے بھی دنیا بھر کے قصے شروع کئے۔ غرض اسی طرح چوردی بدلتے بدلتے مسجد تک پہونچ ہی گئے۔ یہاں ہمراہیوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور اب بھی پڑھیں گے۔ اور دوسرے وہ ہیں جو نہا دھو کپڑے بدل خاص اسی جنازہ کے لئے آئے ہیں تیسرے وہ جو اپنی وضعداری پر قائم ہیں یعنی نماز نہ کبھی پڑھی ہے اور نہ اب پڑھیں گے۔ دور سے مسجد کو دیکھا اور پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جنازہ مسجد تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ان کو کسی دیوار، کسی موٹر یا کسی گاڑی کی آڑ مل گئی۔ یہ وہیں کھڑے ہو گئے اور سگریٹ پی کر یا پان کھا کر انھوں نے وقت گذار دیا۔ ہاں اس بات کا انتظام رکھا کہ نماز ختم ہونے کی اطلاع فوراً مل جائے۔ اِدھر نماز ختم ہوئی اُدھر یہ لوگ مسجد کے دروازے کی طرف بڑھے۔ ادھر جنازہ نکلا،

اُدھر یہ پہونچے بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد ہی سے نکل رہے ہیں۔

یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا۔ اب راستے والوں کی سنئے۔ اگر میت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا۔ اگر جنازہ کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آرہے ہیں۔ آئے مرنے والے کا نام پوچھا مرض دریافت کیا اور واپس ہوگئے۔ گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر حیات و ممات ان ہی کے ذمہ تفویض کر دیا ہے اور یہ صرف اس لئے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر سے مرنے والے کا نام خارج کر دیں۔

موٹر نشینوں کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ تو سمجھتے ہیں کہ سڑکیں انھیں کے لئے بنی ہیں۔ کسی جنازہ کا سڑک پر سے گذرنا ان کو زہر معلوم ہوتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ رفتار کم ہونے سے پٹرول کا نقصان ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ مر کر ان کے پٹرول کا نقصان کرے۔ شوفر ہے کہ ہارن پہ ہارن بجا رہا ہے لوگ ہیں کہ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے ہیں جنازہ ہے کہ ٹیڑھا ترچھا ہو رہا ہے۔ مگر موٹر والے صاحب کی موٹر جس رفتار سے آرہی ہے اسی رفتار سے نکلے گی۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ قیامت آئے گی تو اس کو بھی ہارن بجا بجا کر سامنے سے ہٹانے کی فکر کریں گے۔ خیر کسی نہ کسی طرح یہ تمام مصیبتیں اٹھا کر جنازہ قبرستان پہونچ ہی گیا۔

قبرستان کی حالت پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ جائے عبرت کو جائے وحشت بنا دیا ہے۔ قبرستان کیا ہے، خاصہ ایک جنگل ہے۔

ایک طرف ٹوٹی پھوٹی ایک جھونپڑی پڑی ہے اس میں ایک سقّے صاحب، ان کی بیوی، دس بارہ بچے، پانچ چھ بکریاں، ایک لنگڑا ٹٹو، دو سو مرغیاں، پانچ چھ بلیاں اور خدا معلوم کیا کیا بلیات بھرے پڑے ہیں جس حصے میں قبریں ہیں وہاں کی گھانس بڑھ کر کمر کمر ہو گئی ہے۔ دیواروں کو توڑ کر لوگوں نے راستے بنا لئے ہیں۔ نیم، پیپل، اور خدا معلوم کس کس قسم کے درخت قبروں کے تعویذ اور چبوترے توڑ کر نکل آئے ہیں۔ کوئی قبر دھنس کر کنواں بن گئی ہے۔ کسی کا تعویذ ہی غائب ہے کسی چبوترے کی اینٹیں نکل کر جھونپڑی میں خرچ ہو گئی ہیں۔ غرض کس مپرسی نے اس حصہ کی عجیب حالت کر دی ہے۔ دوسرا حصہ جس میں قبریں نہیں ہیں وہ کسی قدر صاف ہے اور کیوں نہ ہو پہلے حصے کا مردوں سے تعلق ہے اور دوسرے کا زندوں سے۔ مردے تو اپنی قبر کی مرمّت کر نے یا کرانے سے رہے ان کے جو عزیز ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس فضول چیز پر کون کچھ خرچ کرے جن کی زمین ہے وہ تو روپئے کھرے کر چکے۔ اب ان کو اس سے کیا تعلق۔ دوسرے حصے کا صاف رکھا جانا اصول تجارت پر مبنی ہے۔ جب گاہکوں کو گھیرنے کے لئے دکان دار اپنی ایک ایک چیز جھاڑ کر رکھتا ہے تو یہ قبرستان والے اپنی پچاس روپئے گز والی زمین کو کیوں نہ صاف رکھیں۔ خریدتے وقت اچھا مال دیکھ لو پھر تم جانو اور تمھارے مردے جانیں۔ میاں سقّہ رہتے تو قبرستان میں ہیں مگر ہمیشہ پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں۔ ادھر لوگ قبر پر پھول چڑھا کر گئے اور ادھر ان کے بچے سب کے سب سمیٹ لائے۔

رات بھر یہ پھول بستر پر رہے صبح باسی پھول لے جاکر قبر پر چڑھا دیے پھر کیا ہرج ہے؟ زندوں کا کام بھی نکل گیا مردے بھی خوش ہو گئے۔ اس گھر میں پھل بتا کبھی خریدنے کی نوبت نہ آئی۔ قبر کے اچھے اچھے پتھر پر مسالہ پیس لیا۔ اگر کچھ دنوں کوئی دیکھنے بھالنے نہ آیا تو پتھر اکھاڑ جھونپڑی کے پاس لا رکھا۔ بکریاں قبروں پر قلانچیں مارتی پھر رہی ہیں۔ مرغیاں کچی قبروں کو کرید رہی ہیں۔ بچے یا تو چبوترے پر لوٹ رہے ہیں یا تعویذوں کو گھوڑا بنائے بیٹھے ہیں۔ بچیاں قبروں پر بیٹھی اینٹیں اور ٹھیکرے پیس رہی ہیں۔ کسی بے چارے کی قبر پہ چادر پڑی ہے اس پہ مغنی نے گیہوں سکھانے کو ڈال دیے ہیں۔ ٹٹوانی کو ایک اگلی اور ایک پچھلی ٹانگ باندھ کر چھوڑ دیا ہے۔ وہ قبروں میں گھانس چرتی پھرتی ہے۔ اس کے ادھر ادھر پھدکنے سے کسی قبر کی اینٹ گر گئی، کسی کا چونا گرا، کسی کا پتھر گرا۔ اگر ایسے ہی چار پانچ گھوڑے چھوڑ دیے جائیں تو تھوڑے دنوں میں وہی منظر بن جائے جو زلزلہ کے بعد کانگڑے کا ہو گیا تھا۔

جنازہ قبرستان میں کیا گیا فوج میں ترمٹ مچ گیا۔ سلّے کا سارا خاندان اپنا اپنا کام چھوڑ کر جھونپڑی میں گھسا اور اناج لینے کو برتن لے لائن باندھ کر آ بیٹھا۔ کسی کے ہاتھوں میں بے پیندے کا تانبے کا کٹورہ ہے تو کسی کے پاس ٹوٹی رکابی۔ کسی کے پاس مٹی کا پیالہ ہے تو کسی کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا چھاج۔ سچ ہے خدا رازق ہے قبرستان والوں کو بھی گھر بیٹھے رزق پہنچاتا ہے۔

یہ تو قبرستان والوں کی حالت ہوئی اب ساتھ والوں کی کیفیت سنیے۔

جنازہ لاکر لب گور رکھ دیا گیا۔ ایک آتا ہے قبر کو جھانک جاتا ہے۔ دوسرا آتا ہے وہ جھانک جاتا ہے۔ ہر شخص کو زمین سخت ہونے کی شکایت ہے۔ کوئی مزدوروں کو سُست کہتا ہے کوئی پٹاؤ کا نقص بتاتا ہے۔ اور کوئی قبرستان والے کو بُرا کہتا ہے۔ جب اس ریویو سے فراغت پائی تو دو دو تین تین آدمی ایک ایک قبر پر جا بیٹھے۔ چبوترہ کو تخت بنایا اور تعویذ کو گاؤتکیہ اور لگے سگرٹ اور بیڑی کا دم لگانے کسی نے سقہ سے چلم بھرنے کی فرمائش کی۔ اس نے حقہ تازہ کر سلفہ بھر حاضر کیا۔ حقے مزے لے لے کر پئے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی تواضع کی جا رہی ہے۔ سُلفہ پر سلفہ بھروایا جاتا ہے اور یہ وقت کسی نہ کسی طرح کاٹا جاتا ہے۔ یہ توفیق نہیں ہوتی کہ کچھ خدا کی یاد کریں یا ان خفتگان خاک کی حالت کو دیکھ کر عبرت ہی حاصل کریں۔ بعض لوگ ہیں کہ گھانس سے بچتے بچاتے قبروں پر کودتے پھاندتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ وہ صاحب ہیں جن کے مرے ہوئے عزیزوں کے آج دن پھر رہے ہیں۔ یوں تو خدانخواستہ فاتحہ کو کیوں آنے لگے۔ آج شرماشرمی قبرستان میں آ گئے ہیں۔ مفت کرم داشتن کی صورت سے۔ چلو فاتحہ بھی پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب کوئی دوسرا عزیز یا دوست مرے گا تو پھر دیکھا جائے گا۔

ایک صاحب ہیں کہ قبروں کے کتبے ہی پڑھتے پھر رہے ہیں۔ کچھ نوٹ بھی کرتے جاتے ہیں۔ کوئی اچھا کتبہ مل گیا تو دوستوں کو بھی آواز دے کر بلا لیا اور بجائے فاتحہ کے دادِ سخن گوئی دی گئی۔ کچھ اپنا کلام سنایا گیا۔ کچھ اُن کا سنا۔

غرض کوئی نہ کوئی مشغلہ وقت گذارنے کو نکال ہی لیا۔ جو لوگ چبوتروں پر متمکن ہیں ان کی کچھ نہ پوچھو، ہر چبوترہ ایک پارلیمنٹ ہے اور ہر قبر ایک کانگریس کا اجلاس۔ دنیا بھر کی خبروں پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے۔ دفتروں کی کارروائیوں پر بحث ہو رہی ہے۔ افواہوں کے ذرائع اور ان کی تصدیق اور تردید کی جا رہی ہے۔ سفارشیں ہو رہی ہیں، وعدے لئے جا رہے ہیں۔ غرض سب کچھ ہو رہا ہے۔ نہیں ہو رہا ہے تو وہ جو ہونا چاہیئے۔ اور جس غرض سے ساتھ آئے ہیں۔ خیر خدا خدا کر کے خبر آئی کہ قبر تیار ہے۔ کچھ تو قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے۔ کچھ وہیں بیٹھے رہ گئے۔ ایک صاحب نے قبر میں اتر کر گلاب اور عود چھڑکا۔ ایک نے میت کے اوپر کی چادر سمیٹی۔ چادر میں بل دیئے۔ دو صاحبوں نے منھ کے سرے کو پکڑ کر میت کو اٹھایا۔ آٹھ دس نے غل مچایا۔ "سنبھال کے سنبھال کے میت بھاری ہے۔ کمر کے نیچے چادر دو۔ ارے میاں اپنی طرف گھسیٹو۔ ہاں آہستہ سے آہستہ۔" اب میت قبر کے منھ تک آ گئی۔ نیفقروں یا یوں کہو کہ مفت خوروں کو اناج تقسیم ہونے لگا اور قبر کے گرد جو لوگ کھڑے تھے انھوں نے بے تحاشا غل مچانا شروع کیا۔ کوئی کہتا ہے "ذرا کمر کی چادر کھینچو۔ ارے بھئی اتنا بھی دم نہیں ہے۔ دیکھنا کہیں قبر کا پاکھا نہ گرے۔ ہاں ہاں، ذرا اور جھکا کر۔ لا الہ الا اللہ میت بھاری ہے ذرا سنبھال کے، آہستہ آہستہ، بس بھئی بس یہ کوئی قینچ رہا ہے۔" میت کے بندھن کھول دو۔ ارے میاں لو یہ ڈھیلا لو سر کے نیچے رکھ کر منھ قبلہ کی طرف تو کر دو۔ واہ بھئی واہ اتنا بھی نہیں آتا۔ ابھی

منھ پورا نہیں پھرا نیس بھی بس"

یہ مختلف فقرے ایک کی زبان سے نہیں نکلتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آئے۔ ہر شخص ہے کہ غل مچا رہا ہے۔ جو بیچارے قبر میں اترے ہیں وہ پریشان ہیں کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔

بہر حال اس غل غپاڑے کے ساتھ دوست احباب اس مرنے والے کو پہلی منزل تک پہونچا ہی دیتے ہیں۔ اب پٹاؤ کی نوبت آتی ہے اس میں بھی وہی گڑبڑ شروع ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے" یہ کڑی نہیں وہ کڑی لو" کوئی کہتا ہے" لاحول ولا قوۃ مفت سو روپے مار لئے اور کڑیاں دیں تو ایسی" غرض کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ اور اسی گڑبڑ میں پٹاؤ بھی ہو جاتا ہے اور مٹی دینے کی نوبت آتی ہے۔ مٹی تو ہر ایک دیتا ہے اور منھ سے بھی ہر ایک بڑبڑاتا ہے لیکن یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو پڑھنا چاہیئے وہ پڑھتا بھی ہے یا نہیں۔ البتہ لفظ "منہا" بہت اونچی آواز میں کہا جاتا ہے اور باقی سب الفاظ منھ ہی منھ میں ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ جب اس کام سے فراغت پائی اور قبر تیار ہو گئی تو فاتحہ کی نوبت آئی۔ ساتھ آنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس میں شریک نہ ہو۔ ہونٹ سب کے ہلتے ہیں مگر شائد سو میں بھی ایسے بھی نہ ہوں گے جو یہ جانتے ہوں کہ فاتحہ میں کیا کیا سورتیں پڑھتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہی سب کو گھر جانے کی سوجھی۔ یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ مرنے والے کے اعزہ کون ہیں اور ان کی حالت کیا ہے۔ ہاں ان بیچاروں کو گھیرتے ہیں

تو جنازہ لانے والے مزدور گھر سے چکا کر لائے تھے مگر یہاں آکر وہ بھی پاؤں پھیلاتے ہیں۔ کبھی تو کہتے ہیں کہ فاصلہ "بہت تھا"۔ کبھی کہتے ہیں "آپ کی وجہ سے دوسری میت کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ وہاں آپ کے یہاں سے دوگنا مل رہا تھا۔" بہرحال ان مصیبت زدوں کو دق کر کے یہ مزدور کچھ زیادہ ہی لے مرتے ہیں۔

دیکھ لیا آپ نے اس زمانہ کی میت کا رنگ جو میں نے عرض کیا تھا وہ صحیح نکلا یا نہیں؟ اب سوائے اس کے کیا کہوں کہ خدا سے دعا کی جائے کہ اے اللہ اپنے ان بندوں کو نیک ہدایت دے ان کے دل میں درد پیدا کر، یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں اور ہم کیا کیا کر رہے ہیں۔

سلیمان ندوی

سید سلیمان نام، علامہ سلیمان ندوی مشہور۔ موضع دیسنہ ضلع پٹنہ میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ ندوۃ العلماء میں تعلیم پائی۔ بیک وقت عالم دین، مفکر، ادیب، نقاد اور مورخ تھے۔ آپ نے اُردو زبان کو بیش بہا لٹریچر دیا ہے۔ آپ کی تحریر نہایت سلیس اور مدلل ہوتی ہے۔ بیداری فکر، عالمانہ ذہنیت صاف ستھرا پن، سنجیدگی اور متانت آپ کی نثر نگاری کی نمایاں خصوصیت ہے۔

۱۹۵۳ء میں پاکستان میں وفات پائی۔

(۱۴)

مولانا شبلی اُردو شاعر کے لباس میں

مولانا شبلی نعمانی شاعر نہ تھے، مولانا شبلی نعمانی شاعر تھے۔ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ دُرست ہیں۔ وہ شاعر نہ تھے کیونکہ اُن کا نام شاعروں کی فہرست میں نہیں۔ اور پبلک میں شاعری کی حیثیت سے ان کی شہرت نہیں۔ لیکن وہ شاعر تھے کیونکہ ان کے اُردو اور فارسی کے دیوان موجود ہیں۔ علی گڑھ کالج، علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس، ندوۃ العلماء لکھنؤ، کے جلسوں میں وہ بڑی دھوم دھام سے اپنی نظمیں پڑھتے اور اپنے قصیدے سناتے تھے۔ سننے والے سر دھنتے، آنسو بہاتے۔ اور قدر جاننے والے اُن کی زبان کی فصاحت، معنی کی بلاغت اور طرز ادا کی خوبی کو مانتے تھے۔ مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی ہماری زبان کے مشہور مقرر تھے۔ ان کی عادت تھی کہ اپنے لکچر سے پہلے اپنی سیدھی سادی نظم بھی سُنایا کرتے تھے۔ اپنی اسی

قسم کی ایک نظم میں وہ اپنے شعروں کی بے اثر کیفیت کو دیکھ کر کہتے ہیں :۔

تم اپنی نثر کو لو نظم کو چھوڑو نذیر احمد
کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی

مولانا حالی کی شاعری تو مشہور ہے ۔ مگر مولانا شبلی نعمانی کی شاعری ان کے مجموعۂ کمالات کے ڈھیر میں ایسی چھپ گئی کہ وہ بہت کم لوگوں کو نظر آئی ۔........

مولانا شبلی مرحوم بچپن سے شاعر تھے ۔ ان کے بچپن کے ایک اُستاد کہتے تھے کہ مولانا شبلی بچے تھے اور چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھتے تھے ۔ تو اُن کو اوڑھنے کی ایک چادر کی ضرورت ہوئی ۔ اُن کے باپ اعظم گڑھ کے ایک نامور وکیل تھے ۔ تو بیٹے نے باپ سے زبانی کہنے کے بجائے یہ شعر کاغذ پر لکھ کر دیا ؎

پدر جس کا ہوں صاحب تاج ہو
پسر اس کا چادر کو محتاج ہو

باپ بہت خوش ہوئے اور بیٹے کو چادر انعام دی ۔

مولانا شبلی جب اوپر کی کتابیں پڑھنے لگے تو اردو اور فارسی میں شعر کہنے لگے ۔ فارسی شاعری کا ذوق تو بہت اچھا تھا ۔ مگر ان کی اردو شاعری ایسی ہی تھی ' جیسے اکثر نوجوان علم کے زور

با جوانی کے جوش میں شعر کہنے لگتے ہیں۔ حاضر جوابی یہ تھی کہ فوراً شعر کہتے تھے۔ اُن کے عربی اور فارسی کے اُستاد چریا کوٹ ضلع اعظم گڈھ کے مشہور عالم اور ادیب مولانا فاروق تھے۔ شاگرد ایک دفعہ ننگے سر بیٹھا تھا۔ اُستاد نے آکر پیچھے سے سر پر ایک ہلکی سی چپت لگائی اور خوش طبعی سے فرمایا ع

ہے گا چپت گاہ خلائق یہ سر

شاگرد نے فوراً جواب دیا ع

جتنے ہیں سر اُون پہ ہے فائق یہ سر

اعظم گڈھ میں ایک کتب فروش تھے جو اُردو کے دیوان بھی بیچتے تھے۔ مولانا کو اپنے بچپن میں شعر و سخن کا شوق اتنا تھا کہ چھٹیوں کے اوقات میں ان کی دکان میں پہنچ جاتے تھے اور وہیں بیٹھ کر دیوان پڑھا اور دیکھا کرتے تھے اور طبیعت کو مناسبت جو تھی تو بیسوں شعر ان کو یاد ہو جاتے تھے اور لوگوں کو ان کے اس حافظہ پر تعجب ہوتا تھا۔

مولانا کے جوانی کے زمانہ میں شعر و سخن کا عام چرچا تھا۔ ہر پڑھا لکھا آدمی کچھ نہ کچھ اس سے دلچسپی لیتا تھا۔ شہروں میں مشاعروں کی مجلسیں ہوتی تھیں۔ نوجوان اور بوڑھے شوق سے شریک ہوتے تھے۔ اور داد سخن دیتے تھے۔ مولانا بھی اپنے وطن اعظم گڈھ میں

اسی قسم کی مجلسیں کرتے تھے۔ غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ واہ واہ ہوتی تھی۔ سبحان اللہ اور جزاک اللہ کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

اُس زمانہ میں مولانا کا تخلص تسنیم تھا۔ خیال ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں منشی امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی کی شہرت تھی۔ اس لئے تسلیم کے وزن پر تسنیم کا تخلص پسند کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے خود اپنے نام شبلی کو تخلص قرار دیا۔ مولانا شبلی نے کچھ دن ۱۸۷۶ء کے قریب غازی پور کے مدرسہ چشمۂ رحمت میں گذارے تھے۔ وہاں اُردو کے مشہور شاعر شمشاد لکھنوی مدرس تھے۔ وہ اچھے شاعر تھے۔ ان کے دیوان چھپ چکے ہیں اور مولانا سے ان کو تعلق بھی تھا۔ مولانا کی فارسی شاعری کے اصل استاد مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی تھے۔ جو فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ فارسی کے ساتھ اُردو میں بھی نظمیں کہا کرتے تھے۔ ان میں سے دو مسدس ان کے چھپے ہوئے ہیں۔ مسدس فاروقی اور مسدس عوالی۔ پہلے میں اعظم گڈھ کے ۱۸۵۷ء کے بلوہ کا حال لکھا ہے اور دوسرے میں مولانا حالی کے مشہور مسدس کا جواب لکھا ہے۔

مولانا شبلی کی اُردو شاعری بالکل خودرَو پودا ہے۔ نہ انہوں نے اس میں کسی سے اصلاح لی، نہ جم کر کبھی اُردو کی شاعری

کی۔ اور نہ کبھی اُردو شاعری کو عزّت و شہرت کا ذریعہ سمجھا۔ یہاں تک کہ ۱۸۸۳ء تک۔ علی گڑھ جانے سے پہلے وہ اُردو میں خط و کتابت کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اس زمانہ کے اہل علم کی طرح وہ فارسی ہی میں خط لکھتے تھے اور غالب کی طرح ممنت سے لکھتے تھے۔ سیرۃ النعمان جو ۱۸۸۷ء میں لکھی ہے اس تک میں یہ لکھا ہے ؎

ع حرف بہ اُردو زدن آئینِ ما نبود

یعنی اُردو میں لکھنا میرا دستور نہ تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ جس زبان میں لکھنا پڑھنا ان کے لئے عار تھا وہی ان کی شہرت اور غیر فانی زندگی کا سبب بن گئی۔

مولانا کی اُردو شاعری کے چار دور ہیں :-

پہلا :- شروع سے ۱۸۸۳ء تک جب وہ علی گڑھ کالج گئے ہیں۔

دوسرا :- علی گڑھ کے قیام کا زمانہ ۱۸۹۸ء تک۔

تیسرا :- حیدرآباد کا زمانہ اور کچھ لکھنؤ کا، یعنی ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء تک۔

چوتھا :- ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک جس میں انہوں نے وفات پائی۔

نیاز

نیاز محمد خاں نام نیازؔ تخلص۔ ۱۸۸۶ء میں بمقام فتح پور پیدا ہوئے۔ ندوۃ العلما لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔

آپ کا مطالعہ وسیع ہے، تحریر میں بے باکی اور آزادی ہے۔ معمولی سے معمولی بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس میں دلکشی، رنگینی اور رعنائی آجاتی ہے۔ آپ کے مقالات معلومات سے پُر ہیں۔ انسانی بصیرت کے ہوشیار مبصر ہیں۔ قلب کی کیفیات دلکش پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔

اپنی ادبی خدمات کی وجہ سے ادیبوں کی صفِ اول میں جگہ حاصل کر لی ہے۔

۱۵

چند دن بمبئی میں

۲۰ مئی کی شام بھی کیسی مہمک شام تھی، جب میں نے بمبئی کے لیے اپنا اسباب سفر درست کرنا شروع کیا۔ میرا اسباب ہی کیا تھا کہ میں درست کرتا۔ لیکن کسی محبوب مقام کی تیاریاں کرنا گویا تنہائی میں اس کا ذکر کرنا ہے۔ اور میں چاہتا تھا کہ اس کی تکرار ہو، بستر لپیٹ رہا ہوں، لیکن سواد بمبئی سامنے ہے۔ ہوں ہانسی میں، لیکن پھر رہا ہوں بمبئی میں۔ اف رے تخیل تیری لطف پاشیاں!

"بہ بساط شوق تفوذ تخیل" میرا روز کا تجربہ ہے۔ لیکن ہماری یہ اشراقیت کہ بمبئی کا نام سنا اور فوراً اس کے حدود پیش نظر ہو گئے۔ وہاں کی گلیاں، وہاں کے مقامات تفرح کی کیفیتیں، وہاں کے لوگوں کی صورتیں سامنے کھنچ کر رہ گئیں، بسا اوقات زیادہ پُرلطف ثابت ہوتی ہیں اور جب اس جگہ ہم پہنچ جاتے ہیں، تو

معلوم ہوتا ہے۔ کہ تخیّل کی وارفتگی، خیال کی ربودگی کیسی پاکیزہ چیز تھی کہ "حضورِ گلشن بے اختیاری کردہ رنگینم" اور ہمارا طلسمکدۂ دماغ جو "تخیّل" کی بُت سازیوں کا کرشمہ تھا، بہت زیادہ پُرکیف مناظر سے معمور تھا۔ لکھنؤ، آگرہ دہلی وغیرہ جانے سے قبل وہاں کا ذہنی جغرافیہ سامنے تھا اور راتوں کی خلوت میں بار بار وہاں کی گلیاں چھان چکے تھے۔ لیکن جب وہاں پہنچ گئے تو کیا ہوا! وہ جغرافیہ جس میں زمین کے بہترین مناظر کا حال درج تھا، فراموش ہو گیا۔ وہ جغرافیہ جن کی ترکیب بہترین صورت سے ہوئی تھی اور وہ ذرّاتِ حُسن جو وہاں کی گلیوں میں نظر آتے تھے یکسر محو ہو گئے۔ افسوس ہوا کہ ناحق زحمتِ سفر اختیار کی، پردۂ شب پر اپنے تخیّل کی مصوّری ہی اس سے اچھی تھی۔ لیکن صرف بمبئی ایک ایسا مقام نکلا، جس کو دیکھ کر میں محسوس کرنے لگا، ——— گویا میرے تمام اگلے پچھلے قیاسات و تصورات نے جسم اختیار کر لیا ہے اور اسی کا نام بمبئی کر دیا گیا ہے۔ ایک عرصہ سے وہاں جانے کی آرزو قلب میں پرورش پا رہی تھی، لیکن اس کے شباب کی رنگینیوں کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ جب میں نے مصمم ارادہ کر کے اسے اپنے سارے خون میں دوڑا دیا۔

ٹھیک گیارہ بجے شب کو ہانسی سے سوار ہوا۔ اور صبح کو دلی پہنچ کر ۵ بجے آگرہ اُتر پڑا۔ مہمان دلگیر ہوا۔ خیال تھا کہ ایک دن رہوں گا۔ لیکن گرمی کی شدّت نے اجازت نہ دی۔ اور مجبوراً ۶-۷ گھنٹہ کے بعد ہی میں نے رات کی گاڑی سے آخرکار اپنا دو سفر شروع کر دیا۔ جس کا خیال اس وقت بھی میرے تمام اعضاء پر حکمراں ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖیہَا وَمُرْسٰہَا

ریل میں بیٹھے اور سفر طویل ہو، تو سب سے پہلے لطیف معیت کی جستجو ہوتی ہے، یعنی اگر تنہائی نصیب نہ ہو، جو بہتر ندیم ہے، تو خیر وہاں کی بیٹھنے والی صورتیں تو ایسی ہوں، جن کو دیکھ کر بینائی مجروح نہ ہو۔ مگر یہ پہلا شگون نیک تھا کہ میرے ساتھ کوئی نہ تھا۔ اور اس لئے جلدی جلدی بستر کھولا اور کھڑکی میں سر ڈال کے ان نقوش پر نظر ثانی کرنے لگا، جو اس وقت میرے دماغ کے تنہا مالک تھے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنی دیر تک اس لذّت میں مستغرق رہا۔ کیونکہ جب میری آنکھ کھلی تو ۲۲ مئی کا سورج بہت بلند ہو چکا تھا۔ اور ایک جوان فرنگن مجھے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی،

مگر وہ کسی اسٹیشن پر ۹ - ۱۰ بجے کے درمیان اُتر پڑی۔

میں سفر میں اس سے بہت گھبراتا ہوں کہ کوئی مجھ سے اس قدر بے تکلف ہو جائے کہ لامحالہ مجھے اس کے ہر سوال کا جواب دینا پڑے۔ خیر، یہاں تک تو کوئی ایسا حرج نہیں کہ "کہاں جایئے گا" اس کے بعد میں "کیوں" نہیں سُن سکتا۔ اور خاص کر پھر ایسے سفر میں جس کے متعلق اگر میں خود اپنے سے سوال کروں کہ "کیوں جا رہا ہوں" تو کوئی جواب مجھے نہ ملے۔ چنانچہ ایک صاحب نے میری طرف سوال کرنے کو اپنا چہرہ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے کتاب اُٹھا لی اور دیکھنا شروع کیا۔ اور اس طرح میں کھُلی ہوئی اخلاق شکنی سے بچ گیا۔

کسی دور دراز کے مشہور مقام پر جانے والے مسافر سے سوال کیجئے تو وہ نہایت نخوت سے مختصر سا جواب دیتا ہے کہ "کلکتہ" یا "بمبئی"۔ یعنی جس طرح ریل پر سوار ہونے والا پیدل چلنے والوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور اپنے تئیں بہت بالا و برتر سمجھتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی گاڑی میں سفر کرنے والے تفوق کا یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اور پھر تماشہ یہ کہ جہاں کسی نے "کلکتہ" بمبئی یا کسی دوسرے دولتمند شہر کا نام لے دیا تو قریب جانے والے غریب کچھ ایسے

مرعوب ہو جاتے ہیں کہ خواہ مخواہ وہ اس کے اندر شانِ امارت محسوس کرنے لگتے ہیں اور اپنی پھٹی ہوئی آنکھوں سے یہ ظاہر کرنے لگتے ہیں کہ یہ شخص کیسا خوش قسمت ہے؟ مجھ سے اگر کسی نے کچھ پوچھا بھی تو ہر آگے آنے والے اسٹیشن کا نام لے کر کہہ دیا کہ اس طرف جاتا ہوں ــــــــــــــ غرض دن بھر اسی لنوبت میں گزرا کہ کون آتا ہے اور کون جا رہا ہے۔ گرمی کا وہ عالم تھا کہ تالو پیاس سے چٹخا جا رہا تھا۔ اور ریلوے کے انتظام کی یہ حالت تھی کہ ہر اسٹیشن پر غریب مسافر پروانوں کی طرح "ڈول والے" پر گرتے تھے اور وہ سب کے سامنے ڈول کو اوندھا کر کے دکھا دیتا کہ پانی نہیں ہے۔ شام ہوئی تو گرمی میں کچھ تخفیف ہوئی۔ اور طبیعت کو کچھ سکون ہوا۔ اب صرف بارہ گھنٹے فصل تھا کہ ریل، مسافروں کو بمبئی لے جا کر ڈال دیتی۔ اور اس کے لئے دو ثلث مسافت طے ہو گئی تھی۔ میں لیٹ گیا اور کوشش کر کے سو گیا۔

۲۳ر مئی کی صبح کو، جو آنکھ کھلی تو سوادِ بمبئی شروع ہو گیا تھا۔ اور سب سے پہلا منظر کھجوروں کے درختوں کا تھا۔ جو سبز و شاداب ٹیکروں اور پھیلے ہوئے قطعاتِ آب سے مل کر آنکھوں میں سمائے جا رہے تھے۔ راستہ کے خشک و گرم میدانوں

کے دیکھنے کے بعد اچانک یہ سکونِ نظر خدا جانے کیسی نعمت تھا۔
میں اس منظر کی عربیت سے بہت متاثر ہوا اور ایسا محسوس کرنے
لگا گویا دشت نجد میں قیس اتفاقاً کہیں لیلیٰ کو پا گیا ہے ۔ اور
صحرا کی وحشت و خشکی جو شاید اسی ملاقات کی منتظر تھی، اکبارگی
رونق و سرسبزی و خنکی و تری میں تبدیل ہو گئی ہے ۔ اور وہ اِدھر
اُدھر لانبے سبز کھجوروں کے جھنڈ ، وہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں
کا زمردیں سلسلہ ۔ اور پھر اس پر قیامت چادرِ آب کی
غیر متناہی شکنیں ۔!

ایک عرب خاتون ، ایک مصری دوشیزہ کو ریل میں بٹھا کر
اس طرف سے لے جاؤ ۔ ممکن ہے وہ اپنے جذبات کو چہرہ سے
ظاہر نہ ہونے دے ۔ ممکن ہے وہ سانسوں کے نظام میں کوئی فرق
نہ آنے دے ، لیکن اس کی نازک کلائی پر ہاتھ رکھ کر ضربات
نبض کا شمار کرو ۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ یہاں عشق کرنا
سیکھ سکتی ہے ۔ وہ یہاں اپنے اعضاء میں خواہش سپردگی محسوس
کر سکتی ہے ۔ المختصر یہ کہ راستہ کی خستگی کچھ عجیب پُرلطف انبساط
ہو گئی ۔ اور سارے تند اندگرما محو ہو گئے ۔ کوئی آدھ گھنٹے تک
ریل انہی قطعاتِ عرب میں ہوتی ہوئی گزری ۔ یہاں تک کہ
ساڑھے سات بجے آہستہ آہستہ ہو کر اس سرزمین حسن و عشق، اس

بلدۂ شعر و موسیقی میں پہنچ گئی۔ جس کی تمنا میری ہستی کے اندر ایک الگ روح بنی ہوئی رہتی۔ اور اس مقام کی وہی خصوصیت جس نے میرے دل کو تڑپا رکھا تھا، آخرکار پیش نظر ہوگئی۔ پارسیوں کے جنس لطیف کا حُسن گو میرے لئے اجنبی تھا، لیکن یہ خیال کہ بمبئی تو اس کا مسکن ہے، یہاں تو ان کی حکومت ہے۔ فقود کی فراوانی سے تنگ آکر ہجوم حُسن کا آرزومند تھا۔ اور اس پرستش کا کس زبان سے شکریہ ادا کیا جائے کہ دادر اسٹیشن پر پہنچتے ہی اس حُسن کا ایک نہایت پاکیزہ دور شباب نمونہ میری بے خودی و وارفتگی کا ترانۂ خیر مقدم گا رہا تھا۔ میں اس کو اپنا ہی خیر مقدم سمجھوں گا۔ کیونکہ وہ میری گاڑی کے ٹھہرتے ہی اُٹھی اور میں اس کا ترانہ ہی کہوں گا، کیونکہ اُترتے ہی میں نے اس کی آوازِ قدم سُنی۔ آہ! کون جانتا ہے کہ حُسن کی اگر کوئی زبان ہے تو صرف موسیقی۔ اور ایک حسین عورت کی جو حرکت ہے وہ ایک نطق موسیقی ہے جس کا مجاز نسائیت اور صرف "نسائیت" ہے۔ وہ ہاتھ ہلاتی ہے گویا نقش ترنم بنا دیتی ہے۔ چلتی ہے اور اپنے پیروں سے زمین پر نقش موسیقی چھوڑ جاتی ہے۔

آہ! اے موجدِ عشق و محبت، صرف تیری ضرورت ہے

اڈیسن کا دماغ یہاں بیکار ہے۔ گراموفون میں سونڈ کبس کی سوئی جب ریکارڈ کو چھوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ریکارڈ نغمہ منجمد ہے۔........ آواز کائنات کے ذرّے ذرّے میں منقوش ہے۔ دل میں بجائے اس سوئی کے ایک پھانس ہو اور پھر وہ اس ذرّہ سے مَس کرے، تو پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ تمثال نغمہ یہ نقش بردار بمبئی ایک محبّت والے دل کا کس قدر محتاج ہے۔

—— اور اس لئے اے بمبئی! میں بڑا ممنون ہوں کہ تو نے میرے خیر مقدم کے لئے اپنے ان کے بہترین گیتوں میں سے ایک گیت منتخب کیا۔

ضرورت تھی کہ میں اس وقت تنہا چھوڑ دیا جاتا —— اور بالکل آزاد۔ لیکن افسوس ہے کہ مجھے ابھی اور آگے جانا تھا۔ اور یہاں گاڑی بدلنی تھی، اسباب سنبھالنے میں مصروف ہوا۔ لیکن میں نے اپنے ایک دوست کو یہاں پہنچنے کی اطلاع اسی وقت ایک کارڈ لکھ کر دے دی کہ ع

اے رفیقان نوبہار آمد کنوں دیوانہ ام

دادر بمبئی کا لوکل اسٹیشن ہے۔ اور مجھے ماہم جانا تھا جو یہاں سے دو تین اسٹیشن اور آگے ہے۔ اس دل نشین آفت، اس سکون جان قیامت کو، جو پلیٹ فارم پر خراماں تھی "زندہ باد" کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔ اور آدھ گھنٹے میں ماہم پہنچ گئے، جہاں

مجسمۂ صدق و خلوص، پیکرِ محبّت و صفا، ہیکلِ حُسنِ اخلاق مسٹر لطیف الدین احمد میری پذیرائی کے لئے موجود تھے۔

پانچ منٹ میں ہم اُس جگہ پہنچ گئے جہاں قیام کرنا تھا۔ افسوس ہے کہ مسٹر لطیف کی مشغول و منہمک زندگی کو دیکھ کر میں خوش نہ ہوا۔ کیونکہ میری رائے میں حقیقتاً وہ اس کے لئے وضع نہیں ہوئے تھے۔ لیکن ابھی اس تنقید کا موقع نہ تھا۔ اور میں نے ان کو اجازت دے دی کہ وہ جائیں اور اپنا کام کریں' اب مجھے ان سے تین چار گھنٹہ کے بعد ملاقات ہونا تھی۔ اس لئے میں بالکل تنہا رہ گیا اور لگا اطمینان سے بیٹھ کر یہ سوچنے کہ "میں تو یہاں آ کے بھی ویسا ہی زار و خراب رہا"۔

یہ مکان اس سلسلۂ آب کے کنارے ہے، جو بمبئی کو جزیرہ نما بناتا ہے۔ اور اس لئے یوں کہنا چاہیئے کہ میں ساحلِ بحر پر تھا، جہاں میری نگاہ کی پرواز کے لئے ایک وسیع رنگین میدان موجود تھا۔ اس مکان کے چاروں طرف کبھی کھجوروں کے درخت کثرت سے موجود تھے اور وہی معصومیت منظر یہاں بھی پائی جاتی تھی۔

شام کو ہم اور مسٹر لطیف ریل میں بیٹھ کر چرچ گیٹ اسٹیشن گئے۔ اور وکٹوریہ میں بیٹھ کے اس کارگاہِ حسن و جمال پر پہنچے جو

سائنل اپالو کے نام سے مشہور ہے۔

ہاں، میں اس کارگاہِ جمال و لطافت، اس نزہت آباد حسن و نزاکت میں پہنچ گیا: جہاں مجھے اس سے بہت پہلے پہنچنا چاہئے تھا۔

حُسن عام اس سے کہ وہ ایک نوزائیدہ سبزہ کی نرم و نازک پتی اور ایک ہلکے رنگ کی کلی میں آسودہ ہو یا وہ نوعِ انسان کی ایک خاص جنس پانزدہ سالہ دوشیزگی کو اپنا نشیمن بنانا پسند کرے، فطرتاً اس امر کا مقتضی ہے کہ حسن ہی اس کا متجسس ہو۔ جمال ہی اس کی جستجو میں سرگرداں ہو۔ جس طرح نزاکت کا بار اُٹھانے کے لئے نزاکت ہی زیادہ موزوں ہے، بالکل اسی طرح حُسن کی معیت کے لئے حسن ہی پسندیدہ ہے۔ نازک ہونٹوں پر ایک تیتری ہی بیٹھی ہوئی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک حسین و صبیح پیشانی پر صندل ہی کا قشقہ کچھ لُطف دیتا ہے۔

معدنی اشیاء میں سونے اور پارے کی خصوصیات مجھے بہت پسند ہیں۔ وہ جاذب ہے۔ اور یہ مجذوب۔ وہ پسندیدۂ حُسن ہے اور یہ حسن پسند۔ عورت سونے ہی کے زیور پر جان دیتی ہے۔ اور سُنا ہے کہ پارہ کبھی اپنے معدن سے باہر نہیں آتا جب تک کہ کوئی حسین نرکی گردن جُھکا کے جھانک نہیں لیتی۔

بچہ اپنے لطف کے لئے، بچوں ہی کا ساتھ ڈھونڈتا ہے۔ کوئی بوڑھا ان میں بیٹھ بھی جائے تو کیسا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ محفل رقص و سرود میں مغنیہ کی نگاہ وہیں پڑتی ہے، جہاں نوجوان کا مجمع ہوتا ہے۔ کوئی اس کا حسن چھیڑ دے تو پھر دیکھئے، کیسی مست ہو کر جواب دیتی ہے۔ اور جہاں کسی سن رسیدہ شخص نے کوئی بات کہی اور اس کی طبیعت سرد ہوئی۔

حُسن میں کشش ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر کھنچ جانے والی چیز مقبول بھی ہو سکتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ حُسن کا مطلب معنوی کون ہے۔ کیونکہ حقیقتاً مطلوب حُسن ہونے کی اہلیت رکھنا ہی وہ حق ہے جو ہماری رائے میں حسن اول کی معیت کا مستحق ہے۔ موسم برشگال میں اُفق کی سیاہی کا سریع نشو و نما ہم بھی دیکھتے ہیں، چاروں طرف سبزہ ہمیں بھی معلوم ہوتا ہے، باغوں کی فصیل پر طاؤس کا خرام ہمارے دل میں بھی گدگدی پیدا کرتا ہے، کوئل کی مستیاں ہمارے دماغ پر بھی چھا جاتی ہیں۔ لیکن ایک رند سے پوچھو، وہ کہتا ہے کہ میں نہ ہوں تو بادل کا ایک ٹکڑا نظر نہ آئے۔ ہمیشہ خشک سالی کے مصائب رفع کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ لوگ شراب پینا شروع کر دیں کہ کبھی امساک باراں کی

شکایت نہ ہو۔ غرض کہ وہ اُودی اُودی گھٹاؤں کو دیکھ کر بیتاب ہو جاتا ہے۔ اور جب ہم لکان کی چھتیں دیکھا کرتے ہیں اس وقت وہ باہر جنگل میں سبزہ پہ بیٹھ کر جھوما کرتا ہے، قطعاً وہ اُس حُسن موسوم کا مطلوب معنوی ہے۔ اور وہی اس سے لطف اُٹھانے کا اہل ہے۔ مظاہر قدرت کا محبوب اور حسین مناظر کے نزدیک حسین وہی ہے۔ جو اپنے تئیں ان میں محو کر سکے۔ کلی کے اگر زبان ہوتی تو وہ کہہ دیتی کہ مجھے ایک بھونرا چاہئے جو ہر وقت مجھے لپٹائے رہے۔ مجھے پروا نہیں اگر وہ میرا سارا رس نکال لیتا ہے۔ اس کا شوق اس کے لئے مایۂ حیات ہے۔ اور میں خوش ہوں کہ میری بربادی اس کی زندگی ہے۔ کیونکہ اعتراف محبّت کا یہی ایک پسندیدہ طریقہ ہے۔

اسی لئے میں نے کہا کہ

یہاں میرا آنا بعد از وقت ہوا۔ دل میں ولولہ کی فراوانی نہیں کہ حسن مناظر کے لئے جی کھول کے وقت صرف کر سکوں۔ عنفوانِ شباب کی وہ رعنائی نہیں۔ حالانکہ غریب مرد کے صحیفۂ حیات میں یہی ایک تنہا عنوان تھا جو عورت کے مطالعہ کے قابل ہے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہاں آنے کا مجھے بہت شوق

تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں کا پورا لطف اُٹھانے کے لئے اس قدر شوق کافی نہ تھا۔

حُسن سے پوری طرح مستفید ہونے کے جذبات عرصہ ہوا کہ میں اپنی تمناؤں کے ساتھ سینہ میں دفن کر چکا ہوں۔ اور اس لئے ضرورت تھی کہ باقی حیات میں خاص تحریک پیدا کرنے کے لئے کسی محرک کی شدید مواصلت نصیب ہوتی اور وہ کہاں۔ لیکن پھر بھی باوصف ان تمام نقصانات طبیعت کے تباہ و برباد ہو جانا یہاں بہت آسان تھا۔ لیکن شکر ہے کہ سر لطیف کی عدیم الفرصتی میری حیات کا ضامن ہو گئی۔ اور میں زندہ وطن واپس آ سکا۔

جس وقت میں آپالو پہنچا، تو متحیر تھا کہ فی الحقیقت میں کسی ساحل بحر پر کھڑا ہوں؟ یقین نہ ہوتا تھا کہ میں خشکی کا اس قدر حصّہ طے کر کے یہاں آ گیا ہوں، جہاں سے قدرت کی یہ رنگین اعجوبہ نمائیاں شروع ہو کر دُنیا کے تین چوتھائی حصّوں پر قابض ہو گئی ہیں۔ ہموار زمینوں کے لئے قابل عبور سطح امواج! یہ معلوم ہوتا تھا کہ فطرت کی وسعتِ تخیّل نے ایک صورت اختیار کر لی ہے۔

میں سمجھتا تھا کہ اُونچی اُونچی لہروں کا ہیبت ناک،

غیر منقطع سلسلہ اور ایک سامعہ شکن شور کا نام سمندر رہے۔
لیکن یہ دیکھ کر کیسا متحیر ہوا کہ وہ تو صرف ایک سکون ہے،
متحرک۔ ایک خموشی ہے، متلاطم۔ ہائے وہ نرم نرم آواز۔
یہ نہ پوچھو کہ ساحل کے لذیذ سرود میں کیسی ڈوبی جاتی تھی۔
اُف رے موجوں کی پُرخم روانی! رؤف و عارف جا کے دیکھو
اور سر دُھنو۔

چھوٹی چھوٹی کشتیاں، اور بعض بعض تو بالکل وہی
"ڈولت جائے" ایسی آزادی اور تیزی کے ساتھ سمندر
کے سینہ پر دوڑتی پھرتی تھیں کہ قوت بحری کی طرف سے
اعتقاد کچھ کمزور سا نظر آتا تھا۔ لیکن جب ذرا فاصلہ پر ایک
عظیم الشان جہاز سمندر کی ہر سانس کے ساتھ متحرک نظر آیا۔
اور اس سے اور دُور روشنی کا مینار (بحری جگنو) اپنے ضیا کے
فیض و لبسیط سے نگاہوں کو اپنی طرف کھینچنے لگا تو سخت
حیرت ہوئی کہ خدایا یہ تمہارا سکون، یہ ذخار خموشی جو حقیقتًا
پُر زور تلاطم، انقلاب طوفان ہے، کیونکر انسان کو ایسا جری
و بے باک بنا سکی۔

جس وقت ہم ساحل پر پہنچے، شام ہو چکی تھی۔ بجلی
کی روشنی، جو صرف لبِ آب جگمگانے کے لئے وضع ہوئی ہے۔

اور وہ لب آب جس پر آپالو اور چوپاٹی بجا طور سے فخر و ناز کر سکتے ہیں سمندر میں پڑی بھر بھرا رہی تھیں۔ اور تاج محل ہوٹل، جو ہند کا بہترین ہوٹل ہے، مع اپنی تمام روشنیوں، دل آویزیوں اور ارتفاع و شوکت کے پانی کے اندر ہچکولے کھاتا نظر آرہا تھا۔ کشتیوں پر کہیں لوگ سوار ہو رہے تھے۔ دس جارہی تھیں، تو بیس واپس آرہی تھیں۔ مختلف شکل و وضع کے لوگوں کا مجمع تھا۔ جن میں کوئی ٹہل رہا تھا، کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن کیسی پُرلطف و تعجب انگیز بات تھی کہ اس مجمع میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس کا جادۂ نظر دوسرے سے مختلف ہو۔ ایک طوفان نظارہ تھا جو سطح آب پر برپا تھا۔ ایک سیلاب شوق تھا، جو سمندر کی سیّال خموشی کو محیط تھا۔

رشید احمد نام ۱۸۹۵ء میں ضلع جون پور کے قصبہ میں پیدا ہوئے۔
عرصہ تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اُردو کے پروفیسر رہے۔

مزاح نگاری میں آپ کا مقام بہت بلند ہے۔ آپ کی ظرافت کبھی قہقہہ پیدا نہیں کرتی بلکہ دل کو گدگداتی ہے۔ آپ کے مزاج کا پورا لطف اٹھانے کے لئے علمیت اور اور نظر کی گہرائی اور علی گڑھ کی روایات اور وہاں کے دستور وغیرہ سے واقفیت ضروری ہے۔ آپ طنز بڑے غضب کا کرتے ہیں زبان سادہ اور ادبی حُسن سے آراستہ ہے۔

۱۶

کانفرنس

میرے ایک بڑے محترم لیکن چلبلے بزرگ تھے جن کی عادت تھی کہ نہ جب تک دن
میں بشیار جھوٹ نہیں بول لیتے تھے یا اتنی ہی میٹنگ نہیں کر لیتے تھے اس وقت تک نہ خود
چین سے بیٹھتے تھے اور نہ دوسروں کو چین سے بیٹھنے دیتے تھے جھوٹ بولنا چاہتے تھے تو میٹنگ
کرتے تھے اور میٹنگ کرنا چاہتے تھے تو جھوٹ بولتے تھے۔ کمیٹیاں بنانے اور بات
بگاڑنے کا بڑا ذوق رکھتے تھے۔ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، بات چیت، ہار جیت،
مار پیٹ، ہیر پھیر، شادی و غمی، دھینگا دھڑی، سب کچھ میٹنگ کے ذریعے عمل میں
آتا عقل و ایمان سے زیادہ میٹنگ پر بھروسا کرتے۔ سوچتے کچھ تھے، لکھتے کچھ تھے،
پڑھتے کچھ تھے، فیصلہ کچھ ہوتا، کرتے کچھ تھے، اکبر مرحوم آپ کو یاد ہوں گے اور
غالباً ان کا شعر بھی ؎

کمیٹی میں چندے دیا کیجیے　　　　ترقی کے ہجے کیا کیجیے

اکبر کا نسبتہً فارغ البالی کا زمانہ تھا ہمارے ان بزرگ نے وہ زمانہ

پایا تھا جب روپے پیسے کے اعتبار سے تحت اللفظ ہو چکے تھے۔ اس لئے موصوف نے اس شعر میں یہ ترمیم کر دی تھی۔

کمیٹی میں غنچے دیا کیجئے
ترقی کے ہجے کیا کیجئے

جہاں تک میرا تجربہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ کو نہ ہو کہ جب کسی کام کو ٹالنا یا نہ کرنا منظور ہوتا ہے تو وہ کسی کمیٹی کے سپرد کر دیا جاتا ہے اسکے ساتھ جب یہ منظور ہوتا ہے کہ اس کام کو اس قابل نہ رکھا جائے کہ کوئی دوسرا اسے پورا کر سکے تو اس کی مٹی کسی کانفرنس میں پلید کرائی جاتی ہے، کمیٹی، کونسل، کمیشن، جوبلی ڈے وغیرہ ایک ہی مرض کی مختلف دلچسپ علامتیں ہیں۔

پرانے زمانے میں جب ریڈیو کا دور دورہ نہ تھا اس وقت امراض دور کرنے مقدمہ جیتنے، روزی کمانے، اولاد پیدا کرنے مینہ برسانے، محبوب کو قابو میں لانے اور رقیب کو واصل جہنم کرنے کے لئے ٹونے ٹوٹکے سے کام لیا جاتا تھا۔ اب اس قسم کے کاموں کے لئے کونسل اور کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں، عدالتیں کھول دی گئی ہیں۔ ریزولیوشن پاس کئے جاتے ہیں جیل خانے کے دروازے کھٹکھٹائے جاتے ہیں، شریفوں کی پگڑیاں اچھالی جاتی ہیں اور ریڈیو پر تقریر کی جاتی ہے۔

آپ نہیں تو آپ کے بزرگوں نے (اور اس سے نہ آپ کی تحسین منظور ہے اور نہ آپ کے بزرگوں کی توہین) وہ زمانہ یقیناً دیکھا ہوگا جب بارش نہ ہونے پر دیہات کے لڑکے ننگ دھڑنگ محض ایک لنگوٹی زیب ستر کئے دروازے دروازے اُچکتے کودتے شور مچاتے کیچڑ پانی میں چھینٹے چلاتے تھے۔

"کال کلوٹی اُجڑ دھوتی، کالے میگھا پانی دے"

وہ باتیں اب خواب و خیال ہو چکی ہیں، ان کی جگہ اب جلسوں جلوسوں زندہ باد کے نعروں اور بہت سی باتوں نے لے لی ہے جن کا تذکرہ یوں نہیں کرنا کہ ؎

دور کم از سواد وطن باز چوں رسیم

عام طور پر کسی ملک یا قوم یا ادارے کی ترقی کا اندازہ اس کی کمیٹیوں کونسل اور کانفرنس سے کرتے ہیں لوگ ان کے مہمل ہونے کے قائل بھی ہیں۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ کمیٹی اور کانفرنس کی ممبری قوم اور ملک کے لئے مفید ہو یا نہ ہو خود ممبروں کے لئے نہایت نفع بخش ہوتی ہے آپ کے کسی کمیٹی کے ممبر ہو جانے کی دیر ہے آپ کے لڑکے بغیر کسی فیس کے تعلیم حاصل کریں گے۔ ہسپتال والے آپ کا مفت علاج کریں گے، سفر بلا ٹکٹ کر سکیں گے۔ نان لفقہ، بھنگی، بہشتی، نائی، دھوبی، درزی، موچی، گرہ کٹ، کونین فروش، کن میلیے، گورکن، کفن چور، پٹواری، ایڈیٹر، مسخرے سب کی مُفت خدمات آپ کے لئے وقف ہونگی آپ کو اپنی تجہیز و تکفین کے اخراجات کے کسی اور مد میں مالی زیر باری نہ ہوگی، بشرطیکہ مرو آخرت بین کی حیثیت سے آپ نے اس کا انتظام بھی اپنی زندگی ہی میں نہ کر لیا ہو۔ چنانچہ یہ امر مسلّم ہے کہ جو حرکتیں کسی فرد کے لئے جیل خانے جانے کا موجب بن سکتی ہیں وہی باتیں کمیٹی یا کونسل کے ممبروں کے لئے ہر دلعزیزیہ اور ذی اثر ہونے کا ثبوت بہم پہونچاتی ہیں۔

کمیٹی کانفرنس اور اس قسم کے دوسرے اداروں کو جمہوری نظام کی پیداوار

سمجھا جاتا ہے لیکن جمہوری نظام اس وقت تک جمہوری کیوں کر کہا جا سکتا ہے جب تک اس قوم کی روایات یا معمولات جمہوری نہ ہوں جس نے اس نظام کو اختیار کیا ہو ہمارے ملک میں کمیٹیوں یا کونسلوں کی کمی نہیں ہے اور ضابطے کی رو سے آپ ان پر اعتراض بھی نہیں کر سکتے لیکن یہ کمیٹیاں اور کونسلیں کن افراد پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان افراد کی افتاد ذہنی کیا ہوتی ہے یہ بھی اپنی جگہ پر جانی بوجھی ہوئی چیزیں ہیں سب سے زیادہ تکلیف وہ وہ باتیں ہوتی ہیں جو جمہوری نظام کی آڑ میں شخصی جبروت یا جماعتی تنگ نظری کی ترجمان ہوں۔ لیکن اس قسم کی باتیں ہم برابر دیکھتے سنتے آئے ہیں اور ریڈیو پر وہی باتیں دہرائی جو اخبارات میں لکھی ہوں، لیڈروں کا تکیہ کلام ہوں یا تکیہ داروں کی زبان پر ہوں ریڈیو پر تقریر کرنے والوں کی بدنیتی اور بدمذاقی کا ثبوت ہے۔ اسی کو بدمعاشگی بھی کہتے ہیں۔ میں بدمعاشگی کے بجائے نمک حرامی کا لفظ استعمال کرنا چاہتا تھا، لیکن اس خیال سے رک گیا کہ نمک حرامی کی فہرست یوں ہی کیا کم طویل ہے کہ اس کو براڈکاسٹ بھی کیا جائے۔

بہر حال! اس قسم کی باتیں ریڈیو پر تقریر کرنے والوں سے سرزد ہوتی ہوں یا نہیں ریڈیو کا لائسنس نہ رکھنے والوں سے غالباً ضرور سرزد ہوتی ہوں گی غالباً کا لفظ میں نے احتیاطاً استعمال کیا ہے اس سے آپ میرے تذبذب کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور میری احتیاط کا بھی۔ میری طرح آپ بھی عدالتوں یا بڑے آدمیوں سے ڈرتے ہوں تو غالباً، وغیرہ، ممکن اور اسی طرح کے بعض دوسرے احتیاطی الفاظ اور فقروں کا ورد رکھا کیجیے بعض الفاظ میں بھک سے اُڑ جانے والے مادے

کی خاصیت ہوتی ہے ان کے لئے یہ الفاظ پانی کے چھینٹے کا کام دیتے ہیں۔

میں نے ابتدا ہی میں عرض کیا تھا کہ جس بات کو عام طور پر نہیں کرنا مقصود ہوتا ہے کسی کمیٹی کے سپرد کر دیجیے وہ کام بہ تیقن ہو جائے گا کوئی بات یقینی ہو لیکن آپ اسے مشتبہ بنانا چاہتے ہوں تو کمیٹی یہ کام بھی انجام دے گی آپ کسی شخص کو مجرم قرار دینا چاہتے ہوں اور کوئی سبیل اس کے مجرم قرار دینے کی نظر آتی ہو تو یہ فرض کسی کمیٹی کے سپرد کر دیجیے کمیٹی اس کے اسلاف اور اولاد تک کو مجرم ثابت کر دے گی۔ کمیٹی اور کونسل صلح کے زمانے میں وہی کرتی ہیں جو اسلحہ اور بارود جنگ کے زمانے میں کرتے ہیں۔

عدالتوں میں جو چیز فرد جرم کہلاتی ہے وہی کمیٹی یا کانفرنس میں ٹرم آف ریفرنس ہوتی ہے فرق صرف یہ ہے کہ عدالت میں صفائی دینے سے آپ کے بیگناہ ثابت ہونے کا امکان ہے اور آپ بری بھی کئے جا سکتے ہیں۔ کمیٹی یا کمیشن کی زد میں آپ کا جاں بحق ہو جانا مسلّم ہے۔

مثلاً انیٹی کونسل یا میٹنگ کی کارستانیاں ملاحظہ فرمائیے، فرض کیجیے مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ ہندوستان کا چقندر خطرے میں ہے سب سے پہلے یہ خبر اخبار میں شائع کی جائے گی۔ نہایت جلی اور شعلہ ناک سرخیوں کے ساتھ، دوسرے دن تار آنے شروع ہو جائیں گے کہ مسئلہ چقندر پر غور کرنے کے لئے فلاں فلاں مقامات پر جلسے ہوئے جس میں چقندر زندہ باد کے نعرے لگائے گئے اور بالاتفاق آرا یہ تجویز پاس کی گئی کہ ہندوستانی چقندر کے ساتھ بڑی ناانصافی برتی جا رہی ہے۔

اور اس کے مقابلے میں غیر ملکی چقندر کو جو رعائتیں حاصل ہیں اور جو سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں اس سے تمام ملک کے چقندر بیزار ہیں اگر حکومت نے چقندر کے تحفظ میں مناسب کارروائی اختیار نہیں کی تو سارے ملک میں بدامنی پھیل جائے گی۔

چنانچہ تجویز پاس کی گئی کہ تمام ملک میں "یوم چقندر" منایا جائے چقندر کا جلوس نکالا جائے لوگوں کو چاہئے کہ اس دن نہ صرف چقندر کھائیں جن کو میسر نہ آئے وہ چقندر کی صورت بنائیں، عورتیں بطور فیشن اور بچے بطور کھلونا استعمال کریں۔ ریلیف فنڈ کھولا جائے لیڈروں کو اس کے ہار پہنائے جائیں، اطبا نسخوں میں لکھیں۔ شعرا بطور قافیہ استعمال کریں گویئے اس پر تان توڑیں۔ روشن خیال بطور آرٹ، طلبا بطور اسٹرائک وکلا بشکل نظائر پولیس بطور چقندر چارج، مصنفین بطور اردو ہندی یا ہندوستانی استعمال کریں اور ہر شخص اس بات کا عہد کرے کہ جب تک وہ چقندر کو آزاد نہ کرالے گا کوئی کام ایسا نہ کرے گا جو روایاتِ چقندری کے خلاف ہو۔

اس کے بعد ہی کونسل میں یہ سوال پیش ہوگا، کیا حکومت اس عام بے چینی اور ہلچل سے واقف ہے جو چقندر کی حمایت میں راس کماری سے کشمیر اور سندھ سے آسام تک پھیل چکی ہے؟ جواب اثبات میں ہو یا نفی میں، قوم کو اپنے جذبات چقندری سے عہدہ بر آ ہونے کے لئے کونسل کا اجلاس ملتوی کیا جائے اب جن بزرگوں کے پورٹ فولیو میں چقندر ہوگا وہ فرمائیں گے، حکومت اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے کہ

کچھ سرکاری کچھ غیر سرکاری اراکین کا ایک چقندر کمیشن مقرر کیا جائے جو پوری تحقیقات کے بعد اپنی رپورٹ اس کونسل میں پیش کرے۔

چقندر کمیشن کے اراکین کی نامزدگی کا مسئلہ بعض نوعیتوں سے بڑا دلچسپ ہے سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون کون سے ممبر ایسے ہیں جنہیں کسی اور سبب گو بھی، گاجر کمیٹی یا کمیشن میں جگہ نہیں ملی ہے ان کے کھپانے کا بہترین موقع ہے کونسل میں اس قسم کے داغ متنجن یا دل دلیا کا انتظام نہ ہو تو قسم قسم کے ممبروں سے عہدہ برآمد ہونا حکومت کے لئے مشکل ہو جائے اب کمیشن کے اراکین ان مقامات کا دورہ کریں گے جہاں چقندر کا کاروبار ہوتا ہے چقندر کے اعداد فراہم کئے جائیں گے چقندر خوروں کا، چقندر خوروں کی عمر، تعداد نمائندگی تعلیم آمدنی و خرچ حرکات و سکنات، توالد و تناسل کا جائزہ لیا جائے گا غیر ملکی ماہرین چقندر کی خدمات حاصل کی جائیں گی ہر ممبر اپنے اپنے سفر خرچ کا حساب لگائے گا اور بالآخر اس چقندر گردی کو گرمی کے زمانے میں کسی پہاڑ پر ختم کر دیا جائے گا جہاں اس کی رپورٹ تیار کی جائیگی

اس رپورٹ کے شائع ہوتے ہی تمام ملک میں نئے سرے انتشار و ہیجان برپا ہو گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک گول میز کانفرنس قائم ہو گی اس میں شریک کئے جانے کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دیں گے کچھ لوگ چقندر کی حمایت میں بھلے مانسوں کی عزت و عافیت کے درپے ہوں گے کچھ عوام کو ایمان و حرم کا واسطہ دلا کر اپنا جلوس نکلوائیں گے کچھ مسجد کے سامنے باجا بجائیں گے کچھ ارتھی پر ڈھیلے پھینکیں گے کچھ خطبہ صدارت تصنیف فرمائیں گے، کچھ فاقہ کریں گے، کچھ تار بھیجیں گے

کچھ انٹرویو دیں گے، بقیہ ہڑ مچائیں گے، اسٹرائک کریں گے، جیل خانے جائیں گے، ایک آدھ مر بھی جائے گا۔ انجام یہ ہو گا کہ ان میں سے بعض گول میز کانفرنس کے ممبر بنائے جائیں گے اور بقیہ سنکھیا کھانے یا سرکاری گواہ بننے کی فکر کریں گے۔

دنیا میں جب تعلیم اور بیروزگاری عام ہوتی ہے تو آمدنی کے عجیب و غریب ذرائع بھی نکل آتے ہیں، بے روزگاری سے میری مراد معاش میسر آنا ہی نہیں بلکہ اکثر معقول مشغلے کا میسر آنا بھی ہے کسی زمانے میں ہمارے یہاں کھانے پینے کی کمی نہ تھی تو لوگ پتنگ اڑاتے تھے، بٹیر لڑاتے تھے اور دوائیں کھاتے تھے اب افواہیں اڑاتے ہیں باہمیں لڑاتے ہیں، دعوتیں کھاتے ہیں پہلے معیشت تھی، مشغلے نہ تھے اب مشغلے ہیں معیشت نہیں ہے پہلے روسا رتھے جن کے مصاحب ہوتے تھے ارباب نشاط تھے اور ٹپکے گانے تھے اب لیڈر ہیں جن کے مصاحب اور ارباب نشاط بھی ہیں" تو نمیج سے ڈرتا اور آپ سے معافی مانگتا ہوں ٹپکے گانے کے بجائے قومی نعرے اور خطبۂ صدارت ہیں جن میں کہیں غزل کا لوچ، قصیدے کا زور، رجز کا آہنگ مثنوی کی روحانی اور مرثیے کا سوز اور گداز ہے تو کہیں تعصب کی بساند، سیخت کی بجواس اور حسد کی سڑاند ہے پہلے جو کچھ درباروں اور حرم سراؤں میں ہوتا تھا۔ اب کمیٹیوں اور کانفرنسوں میں ہوتا ہے پہلے جو نصیب دشمناں تھا اب ترد دستاں ہے۔

کمیٹیاں اور کانفرنس بجائے خود معقول چیزیں ہیں لیکن معقول ہی چیزیں جب نامعقول سے وسیلے بن جاتی ہیں تو شرفا کو پگڑی سنبھالنے اور بھیک مانگنے کے سوا چارہ نہیں رہتا جمہوری نظام، جس کے یہ کمیٹی کونسل کھلونے ہیں سب سے

بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ اس میں نامعقول سے نامعقول بات کو بھی فروغ دینے کا امکان بڑھ جاتا ہے لیکن یہاں جمہوری اور غیر جمہوری نظام کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اس قسم کی بحثیں یا تو اسکول کالج کے طلبا کرتے ہیں مثلاً فلاں شخص نے یہ کہا ہے۔ فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے میں یہ کہتا ہوں وغیرہ۔ آپ ملتے ہیں تو آپ کی خوش نصیبی ورنہ "ہیں کسان کی آسمان نوجوان کا۔ گمان انسان کی تیر۔ شیطان کا اور گردن آپ کی" لیڈروں کا کیا پوچھنا ان کو ہار پہنایئے نعرے لگایئے، ووٹ دیجیئے اور جو جی چاہے۔ کہلوا لیجیئے اور یہاں سب سے انوکھی بحث کرنی ہے یعنی بات ایسی ہو جو گنوار تعلیم یافتہ بچے، نوجوان بوڑھے، خواتین حاکم محکوم سب کے لئے یکساں مفید اور دلچسپ ہو کمیٹی کے ارکان اور ریڈیو کے سامعین دونوں کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ کون اور کس قسم کے لوگ ہوں، فرض کیجئے میں تو گنوار کو سمجھا رہا ہوں نوجوان یہ سمجھیں کہ ان کی توہین ہو رہی ہے خواتین کی طرف متوجہ ہوں تو بوڑھے بگڑ کھڑے ہوں بوڑھوں کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کروں تو بچے تالیاں بجانے لگیں نوجوان سے مخاطب ہوں تو بگڑ کی فریاد کرنے لگے محکوم سے بولوں تو حاکم گرفتار کرے اور حاکم سے گفتگو کیجئے تو "تو نور علیٰ نور" نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔

کمیٹی اور کانفرنس کا شکریہ میں نے ضرور ادا کیا ہے لیکن میں یا ان لوگوں میں نہیں ہوں جو شراب کے عیب بیان کرتے ہیں اس کے ہنر نظر انداز کر جاتے ہیں میں تو اکثر موقع پر ہنر بیان کرتا ہوں اور عیب سے درگذر کرتا ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان میں ایک موقع شراب کا بھی ہوتا ہے اور یہ میں اس لئے کہہ دیتا ہوں کہ شراب کی دوکان بڑھ چکی ہے لیکن تہمت شراب اب بھی باقی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کونسل اور کمیٹیوں میں بعض بڑی خوبیاں بھی ہیں بشرطیکہ جو بات طے پائے وہ کمیٹی اور کونسل کا بے لاگ فیصلہ ہو نہ یہ کہ فیصلہ پہلے ہو چکا ہو، گو اس جرح اور بحث بعد میں ہو عام طور پر دیکھا یہی جاتا ہے کہ جو مقصد کسی خاص شخص یا جماعت کے مدنظر ہوتا ہے وہی بالآخر کمیٹی یا کمیشن کا فیصلہ ہوتا ہے یعنی عقلمند فیصلہ کرتا ہے۔ اس کا اعلان بیوقوفوں سے کراتا ہے میں سیاسیات یا قومیات کا معلم نہ مداری لیکن سیاسی اور قومی بازیگر کے تماشے دیکھتا رہتا ہوں نت نئے تماشے ہم سب سیاسی اور قومی حقوق و اختیارات کو پہچانتے تو خوب ہیں لیکن ان کا سزاوار بننے کے لئے جس محبت خلوص یا رواداری کی ضرورت ہوتی ہے اس کے متحمل نہیں ہوتے ہم "گفتم و شد" چاہتے ہیں و "گردم و شد" کی زحمتوں سے بچنا چاہتے ہیں ہم مختلف الخیال لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر نہ عقل کی باتیں کرتے ہیں اور نہ خلوص کا ثبوت دیتے ہیں دوسروں کی بات سننے اور اپنی منوانے میں جس تحمل، حسب وسعت نظر اور جس فکر و تدبر کی ضرورت ہوتی ہے ہم ان سے جھپلتے ہیں۔

ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو کمیٹی میں بیٹھ کر صحیح دلائل سے دوسروں کو قائل کر سکتے ہوں ہم اپنے نقطہ خیال کو نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر پرکھنے سے گھبراتے ہیں ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کے لئے جس محنت و اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہم میں نہ ہو۔ بُرا کہنے سے بھلا بننا زیادہ مشکل ہے۔ یاد رکھئے دنیا کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے اختلافات سہنے اور سلجھانے پڑیں گے مجھ سے خفا ہو جئے اقبال کو دعا دیجئے جس نے کچھ سمجھ کر ہی کہا ہوگا ؎

تری دعا ہے کہ ہو میری آرزو پوری ٭ مری دعا کہ تری آرزو بدل جائے

احمد شاہ پطرس مشہور طنز و مزاح پر گہری نظر رکھتے ہیں۔
واقعات کی عکاسی ایسے فطری انداز میں کرتے ہیں کہ مزاح کا پہلو
خود بخود اُبھر آتا ہے۔ کردار نگاری میں آپ کو کمال حاصل ہے۔
آپ کی تحریروں میں ٹھٹھے نہیں بلکہ شائستہ تبسم ہے۔ زبان
سادہ، رواں اور دلکش ہے۔ آپ نے بہت کم لکھا ہے لیکن
جو کچھ لکھا ہے وہ اُردو کے مزاحیہ ادب میں ایک اعلیٰ درجہ
رکھتا ہے۔

۱۷

لاہور کا جغرافیہ

حدود اربعہ - کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حدود اربعہ بھی ہوا کرتا تھا. لیکن طلبا کی سہولت کے لئے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے. اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے. ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا جس کا دارالخلافہ پنجاب ہوگا. یوں سمجھئے کہ لاہور ایک جسم ہے جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے. لیکن ورم مواد فاسد سے بھرا ہوا ہے. گویا یہ توسیع عارضہ ہے, جو اس کے جسم کو لاحق ہے.

آب و ہوا - لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں, جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں. حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے. میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجہ پر پہونچی کہ اس ترقی کے دور میں جب کہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں. اہل لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں - بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے.

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی. اس لئے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفاد عامہ کے پیش نظر اہل شہر ہوا کا بے جا استعمال نہ کریں - بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں - چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لئے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے. کمیٹی

نے جا بجا ڈھوئیں اور گرمی کے مہیا کرنے کے لئے مرکز کھول دئیے ہیں۔ جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کئے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے۔ کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بہم رسانی آب کے لئے ایک اسکیم عرصے سے کمیٹی کے زیر غور ہے۔ یہ اسکیم نظام سقّے کے وقت سے چلی آتی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقّے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اہم مسوّدات بعض تو تلف ہو چکے ہیں۔ اور جو باقی ہیں۔ ان کے پڑھنے میں بہت دقّت پیش آرہی ہے۔ اس لئے ممکن ہے تحقیق و تدقیق میں چند سال اور لگ جائیں عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر محلے کا اپنا ایک دریا ہوگا۔ جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی۔ اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہوگی جو رائے دہندگی کے موقع پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سقّے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے۔ کہ پانی پہونچانے کے لئے نل ضروری ہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کر کے جا بجا نل لگوا دئیے ہیں۔ فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بھری ہے۔ لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔ چنانچہ بعض بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں۔ اہل شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔

شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں منا رہے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت ۔ جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کو یہاں کے آمد و رفت کے ذرائع کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہیئں تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کما حقہٗ اثر پذیر ہو سکیں جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گذرتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جسے شیر شاہ سوری نے بنایا تھا۔ یہ آثار قدیمہ میں شمار ہوتی ہے اور بیحد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے چنانچہ اس میں کسی قسم کا رد و بدل گوارہ نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں جنہوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیئے تھے۔ آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں الٹ جاتے ہیں اور عظمت رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لئے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیئے لگا لیتے ہیں۔ اور سامنے دو بک لگا کر ان میں ایک گھوڑا ٹانگ دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگہ کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختہ پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں۔ تاکہ پھیلنے میں سہولت ہو۔ اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جائے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قصابوں کی دوکانوں پر انہی کا گوشت بکتا ہے۔ اور زین کس کر کھایا جاتا ہے۔

تانگوں میں ان کی بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کئے جاتے ہیں۔ بناسپتی گھوڑا شکل وصورت میں دُم دار ستارے سے ملتا ہے۔ کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دُم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کرتے وقت اپنی دُم کو دبا لیتا ہے۔ اور اس ضبطِ نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے۔ تاکہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنے نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ہر ایک مسام لطف اندوز ہو سکے۔

قابلِ دید مقامات۔ لاہور میں قابلِ دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دوہری بنائی جاتی ہیں۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں۔ اور پھر اس پر اشتہاروں کو پلستر کر دیا جاتا ہے۔ جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں۔ مثلاً "اہلِ لاہور کو مژدہ" یا "اچھا اور سستا مال"۔ اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے۔ جن کے مخاطب اہلِ علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں۔ مثلاً "گریجوایٹ درزی ہاؤس" یا "سٹوڈنٹوں کے لئے نادر موقع" یا "کہتی ہے ہم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا"۔ رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری پر ایک مکمل ڈائرکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ مندرج ہے۔ بائیں طرف حافظے کی گولیوں کا بیان ہے۔ اس اس کھڑکی کے اوپر انجمن خدامِ ملّت کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے۔ اس کھڑکی

پر کسی مشہور لیڈر کے خانگی حالات بالوضاحت بیان کر دیئے گئے ہیں عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے۔ اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کے فلم کے محاسن گنوا رکھے ہیں۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں۔ اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلاب عظیم کی ابتلا چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے۔ اس لئے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ اور ان کے پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بہت دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیوار پر نقش کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ دقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لئے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا تھا۔ اور لوٹتے تک وہاں اہالیان لاہور کو تازہ اندے سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جہاں بحروف جلی "محمد علی دندان ساز" لکھا ہے۔ وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے۔ جہاں "بجلی کا پانی بھاپ کا بڑا ہسپتال" لکھا ہے وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں "خالص گھی کی مٹھائی" امتیاز علی صاحب تاج کا مکان ہے "کرشنا بیوٹی کریم" شالامار باغ کو اور "کھانسی کا مجرب نسخہ" جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت و حرفت ۔ اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ ہر رسالے کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں۔ عام نمبر میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں۔ اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے۔ اور فن تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے۔ پریسیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں۔ اس لئے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں۔ اس لئے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی کانفرنس مذہبی کا افتتاح کرتا ہے۔ سہ پہر کو کسی سینما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے، اس سے ان کا مطمح نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے جو تینوں موقعوں پر کام آسکتی ہے۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پیداوار ۔ لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبا ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً آخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔

طلباء کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں۔ قسم اول جمالی کہلاتی ہے۔ طلباء عام طور پہ پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں۔ بعد ازاں دھوبی اور پھر نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں اور اس عمل کے بعد کسی رستوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ غروب آفتاب کے بعد کسی سنیما یا سینما کے گرد ونواح میں ؎

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں

اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

شمعیں کئی ہوتی ہیں لیکن سب کی تصویر ایک البم میں جمع کر کے اپنے پاس رکھ چھوڑتے ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک کو خط لکھتے ہیں۔ دوسری قسم جلالی طلباء کی ہے۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے۔ اس لئے ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لئے نکلتے ہیں اور جود و سخا کے خم لنڈھاتے پھرتے ہیں۔ کالج کی خوراک انہیں راس نہیں آتی۔ اس لئے ہوسٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔ تیسری قسم خیالی طلباء کی ہے۔ یہ اکثر رُوپ اور اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پہ بآوازِ بلند تبادلۂ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں۔ اور آفرینش اور نفسیات جنسی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں۔ صحت جسمانی کو ارتقائے انسانی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے علی الصباح پانچ چھ ڈنڈ پیلتے ہیں اور شام کو ہوسٹل کی چھت پہ گھرے

سانس لیتے ہیں۔ گانے ضرور ہیں لیکن اکثر بے سُرے ہوتے ہیں۔ چوتھی قسم خالی طلبار کی ہے۔ یہ طلبار کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر نہیں ہونے پاتا۔ کتابیں، امتحانات، مطالعہ اور اس قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے۔ جس معصومیت کو لے کر کالج میں پہنچتے تھے اُسے آخر تک ملوث ہونے نہیں دیتے اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔

پچھلے چند سالوں سے طلبار کی ایک اور قسم دکھائی دینے لگی ہے۔ لیکن ان کو اچھی طرح دیکھنے کے لئے محدّب شیشے کا استعمال ضروری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے اور اگر چاہیں تو اپنی اناکے ساتھ زنانے ڈبے میں بھی سفر کر سکتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عاید کر دی ہے کہ آئندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کئے جائیں جو دُودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔

طبعی حالات۔ لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

دی آزاد پریس سبزی باغ پٹنہ ۴